اسلام
اور عصرِ جدید

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیّہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵

Vol. LVIII No. 2 R.N.I. No. 1761/69 April 2026

ISLAM AUR ASR-I-JADEED

Peer Reviewed

ISSN 2278-2109

Zakir Husain Institute of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia, Jamia Nagar, New Delhi-25
E-mail:zhis@jmi.ac.in

اسلام اور عصرِ جدید

مدیر اعلیٰ

پروفیسر حبیب اللہ خاں

مدیر

ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی

نائب مدیر

ڈاکٹر محمد سعید انور

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

(سہ ماہی)
اسلام اور عصرِ جدید

Peer Reviewed

ISSN 2278-2109

(جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر)

جلد:۵۸	اپریل ۲۰۲۶ء	شمارہ:۲

زرِ اشتراک

	فی شمارہ	سالانہ	
اندرونِ ملک	-/100 روپے	-/380 روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان وبنگلہ دیش	4/امریکی ڈالر	15امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک	12/امریکی ڈالر	40امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے)

حیاتیاتی رکنیت:

❑ اندرونِ ملک 5000/روپے ❑ پاکستان وبنگلہ دیش 150 امریکی ڈالر ❑ دیگر ممالک 400 امریکی ڈالر

نوشاد عالم
تصحیح وتزئین

فیضی گرافکس
کور ڈزائن

راشد احمد
پرنٹنگ اسسٹنٹ

ملنے کا پتا: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

Website: https://jmi.ac.in/zhiis E-mail:zhis@jmi.ac.in

طابع وناشر: اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

نوٹ: مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

بانی و مدیر

ڈاکٹر سیّد عابد حسین (مرحوم)

شیخ الجامعہ

پروفیسر مظہر آصف (صدر)

مجلسِ مشاورت

- پروفیسر نجمہ اختر
- پروفیسر طلعت احمد
- نجیب جنگ (آئی۔اے۔ایس۔ریٹائرڈ)
- محمد احمد ذکی (لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ)

مجلسِ ادارت

- پدم شری پروفیسر اختر الواسع
- پروفیسر اقتدار محمد خاں
- پروفیسر عبید اللہ فہد فلاحی
- پروفیسر شمس کمال انجم
- پروفیسر محمد مسیح الرحمٰن
- ڈاکٹر محمد ارشد
- ڈاکٹر صہیب عالم
- ڈاکٹر آفتاب احمد
- پروفیسر زبیر احمد فاروقی
- پروفیسر عبد الحلیم
- پروفیسر فوزان احمد
- پروفیسر محمد فہیم اختر ندوی
- ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی
- ڈاکٹر ہیفاء شاکری
- ڈاکٹر وارث مظہری

فہرست مراجعین

- پروفیسر عبدالماجد قاضی
  شعبہ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

- ڈاکٹر عمر فاروق
  شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

- ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی
  شعبہ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

- پروفیسر توقیر عالم
  شعبہ سنی تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ)

- پروفیسر فہیم اختر ندوی
  شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (حیدرآباد)

- ڈاکٹر مغیث احمد
  شعبہ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی (وارانسی)

فہرست

❑ حرف آغاز	ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی	۷
❑ ایک خدا تین مذاہب: تصادم کا تاریخی سفر	پروفیسر مظہر آصف	۱۳
❑ تفسیر الکشّاف پر تحقیق وتنقید (پروفیسر فضل الرحمٰن گنّوری اور مصطفیٰ الصّاوی الجوینی کا تقابل)	پروفیسر عبید اللہ فہد فلاحی	۲۱
❑ سمندروں میں عربوں کی تجارتی سرگرمیاں	ڈاکٹر محمد ایوب ندوی	۵۵

❑ مولانا عبیداللہ سندھی پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کی تالیفات وترتیبات (پیش لفظ، دیباچے اور مقدمے)	ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری	٦۵
❑ متکلم شبلی	ڈاکٹر محمد ارشد	۹۱
❑ فکر اسلامی کی تشکیل جدید ضرورت اور مسائل	ڈاکٹر وارث مظہری	۹۹
❑ مغربی فکر وفلسفہ: فہم وتنقید کے زاویے	سید خالد جامعی	۱۱۵
❑ شاہ ولی اللہ کی قرآنی بصیرت: عصر حاضر میں اس کی اہمیت اور ضرورت	ڈاکٹر علی محمد بٹ/ ڈاکٹر ارشاد احمد میر	۱۳۳

حرف آغاز

تعلیم میں اخلاقیات کی اہمیت اور ضرورت

تعلیم اور اخلاقیات کا رشتہ بہت گہرا ہے۔تعلیم صرف معلومات حاصل کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اخلاقی تربیت، کردار سازی اور قلب و ذہن کی ایسی تربیت کا نام ہے جس کے ذریعے انسان صحیح اور غلط میں تمیز کر سکے، حق و باطل میں فرق کر سکے، اچھائی و برائی کا فرق اسے معلوم ہو اور عملی طور پر اس کا ذہن وفکر اچھائی سے وابستہ اور برائی سے متنفر ہو جائے اور اس تربیت کے ذریعے وہ معاشرے کا بہترین فرد بن سکے اور سب سے اہم بات یہ کہ اپنے رب کو پہچان سکے، اپنے خالق کی معرفت حاصل کر کے اس کی مرضیات کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال سکے۔ جب انسان اپنے رب کو جان لیتا ہے اور اس کی عظمت کا حقیقی احساس اس کے اندر پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو جاتا ہے، اس لیے قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ اہلِ علم ہی اللہ سے ڈرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن مجید میں آیا ہے کہ بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔

تعلیم اور اخلاقیات کا موضوع جتنا باہم مربوط ہے، اتنا ہی اس میں متعدد پہلو اور متفرق جہات ہیں جیسے حصولِ علم کی اخلاقیات، طلبہ، اساتذہ اور تعلیمی ادارے کی اخلاقیات، اسی طرح نصاب تعلیم کی اخلاقیات وغیرہ تمام پہلو اس میں شامل ہیں۔

تعلیم میں اخلاقیات کی اہمیت وضرورت کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ اخلاقی تربیت ہی دراصل تعلیم کی روح ہے۔ تعلیم مزاج و کردار اور قلب و ذہن کی تربیت کا نام ہے۔ یہ تربیت ایک سطح پر عام ہوتی ہے اس کو عمومی تربیت کہہ سکتے ہیں جو انسان اپنے معاشرے اور ماحول میں حاصل کرتا ہے اور ایک سطح پر خاص ہوتی ہے یعنی تعلیمی اداروں میں کی جانے والی اخلاقی تربیت۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کے ذہن وفکر کو ایسی جلا حاصل ہو جائے جس کے ذریعہ انسان بدویت یا جہالت کے ظلمت کدے سے نکل کر علم وعرفان کے نور سے بہرہ مند ہو جائے۔ یہ مرحلہ انسان کی زندگی کا بہت اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں انسان کی اخلاقی تربیت کا مقام ایسا ہی ہے جیسا کسی چمن زار کی آبیاری کے لیے پانی کا ہوتا ہے، اگر اس مرحلہ میں انسان کے اندر اخلاقی تعلیم کی تخم ریزی نہیں کی گئی تو اس شخص کا ارتقا اس طرح ہوگا کہ وہ نہ معاشرے کے لیے بہتر فرد بن سکے گا اور نہ ہی اپنی آخرت کی نجات وفلاح کو پہنچ سکے گا، بلکہ خطرہ یہ بھی ہے کہ بغیر تربیت اور اخلاقی تعلیم کے اس کو تعلیم دینا اور تعلیم کے اعلی مراحل کی تکمیل کرانا بجائے مفید ہونے کے مضر اثرات کا حامل ہوگا۔ شاید ایسے لوگوں کے لیے کہا گیا ہے۔

بے ادب را علم و فن آموختن
دادن تیغ بدست را ہزن

(یعنی بے ادب کو علم سکھانا کسی رہزن کو مسلح کرنے جیسا ہے۔)

اس لیے تعلیمی اداروں میں نہ صرف اخلاقیات کی تعلیم ضروری

ہے، بلکہ ثانوی درجات کی سطح پر اخلاقی تعلیم اور اخلاقی تربیت کو لازمی ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمارے مدارس اور اسکولوں میں یہ تعلیم نہیں دی جاتی یا ہمارے معاشرتی نظام میں اس طرح کی تربیت کا فقدان ہے۔ ہمارے یہاں تعلیم کے اس مرحلے پر روایتی طور پر اخلاقی تربیت کا خصوصی اہتمام موجود ہے، لیکن وہ پورا نظام بڑی حد تک لاشعوری اور موروثی نوعیت کا ہے۔ جدید ذہن کے مارے ہوئے لوگ اس پر اعتراضات بھی کرتے ہیں اور اس کو عہد وسطی کی جاگیردارانہ ذہنیت کا شاخسانہ قرار دے کر اس کو سوختنی قرار دیتے ہیں۔ 'جدیدیت' کی وبا نے ان سب قدروں کو پامال کرنے کی طرح ڈالی ہے اور 'مابعد جدیدیت' کے پیچاک نے اس عظیم خسارے کے احساسِ زیاں کو بھی ذہن وعقل سے محو کر دیا۔

روایتی اقدار میں اگر کچھ قابل اعتراض ہے تو اس کی اصلاح کی جانی چاہیے، یہ نہیں کہ صدیوں کے اس قیمتی اثاثے کو بیک جنبش قلم کالعدم قرار دے دیا جائے۔ معاشرے کے اندر صالح روایات کو برقرار رکھنے میں اس نظام کا بڑا کردار ہے۔ یہاں اصل مسئلہ نظام کا نہیں ہے بلکہ اس کے ادراک اور شعور کا ہے، اس کو شعور وآگہی کے ساتھ عمل کا حصہ نہ بنانے کی وجہ سے اس کے خاطر خواہ مثبت نتائج سامنے نہیں آتے، اگر اس کو مزید فعال کیا جائے اور بچوں کو شعوری طور پر اس کے فوائد سے آگاہ کیا جائے تو اس کی افادیت دوچند ہوسکتی ہے۔

ثانوی درجات کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لوگ اختصاصی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور یہ اختصاصی تعلیم درجہ بدرجہ ہوتی ہے اور یہ اختصاص بتدریج فنی اور ہنرمندانہ اختصاص بنتا جاتا ہے۔ اس مرحلہ میں انسان کو خصوصی اخلاقی تعلیم کی اشد ضرورت ہے جو اس کے پیشہ یا میدان اختصاص کی باریکیوں کے ساتھ ساتھ اس کی ذمہ داریوں اور اس اختصاص یا فن کے ساتھ وابستہ اس کی افادیت کو مزید فعالیت عطا کر سکے۔ اسی ضرورت کو

پورا کرنے کے لیے اب پی ایچ ڈی کی سطح پر بھی باضابطہ اخلاقیات کی تدریس کی جاتی ہے۔

اخلاقی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا فقدان انسان کی ترقی میں تو مانع ہوتا ہی ہے، معاشرے میں انسان کے بہتر اور مفید کردار میں بھی رکاوٹ بن جاتا ہے، آج کے زمانے میں اس کی مثال جتنی واضح ہے شاید پہلے کبھی نہیں تھی۔ اخلاقی تعلیم انسان کو جن اوصاف سے متصف کرتی ہے، بہتر اخلاقی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ اوصاف بعض لوگوں میں یا تو پیدا ہی نہیں ہو پاتے یا ناقص رہ جاتے ہیں اور یہی دراصل وہ بنیادی وجہ ہے جو انسان کو حیوانیت کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کے اندر سے احساس ذمہ داری کو فنا کر دیتی ہے۔ بلکہ اب تو ایسا بھی ہو رہا ہے کہ کچھ لوگ جو جتنا زیادہ پڑھ لکھ جاتے ہیں اتنے ہی اخلاق سے عاری ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم ان کو بہتر انسان بنانے کے بجائے مزید کرپٹ بنا دیتی ہے۔ قانون کو دھوکہ دینا اس کی نظر میں فن بن جاتا ہے۔ دولت کی ہوس اس کو انسان کے جسم و جان سے کھیلنے میں بھی رکاوٹ نہیں بنتی، وہ کسی کو بھی دھوکہ دے سکتا ہے، وہ قومی سرمایے کو ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کر لیتا ہے، اعلیٰ قومی تعلیم گاہوں سے نکل کر وہ بجائے قومی خدمت کے الٹا قوم کو لوٹنے کا کام کرتا ہے۔ اخلاقی تعلیم کے زوال یا ناکافی اخلاقی تربیت اس کے اندر بجائے اصلاح اور جذبہ خدمت پیدا کرنے کے الٹے اس کو فساد اور حصول زر کی طمع میں لگا دیتی ہے۔

موجودہ دور کے بیشتر مسائل جن سے عالم انسانیت کراہ رہی ہے ان کا اصل سبب اخلاقی تربیت کی کمی اور ناکافی اخلاقی تعلیم ہے۔ موجودہ دور میں تعلیم کا مقصد ہی حصول زر یا حصول اقتدار بنا لیا گیا ہے، اس کے نتیجہ میں انسان تمام ممکنہ وسائل کو شر و فساد کے لیے استعمال کر رہا ہے اور اس نے پوری دنیا میں انارکی اور بڑی خراب اخلاقی صورت حال پیدا کر دی ہے۔ اس بحران اور فساد کا واحد حل اور علاج

دراصل اخلاقی تعلیم وتربیت ہی ہے۔

اخلاقی تعلیم انسانیت کے لیے اتنی ضروری ہے کہ قرآن پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کو عظیم ترین اخلاق فرمایا گیا ہے کہ **انک لعلی خلق عظیم** ۔(بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ معیار پر فائز ہیں) اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا ایک مقصد ہی یہ قرار دیا کہ میں اخلاقی تعلیم کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

اسی تناظر میں یہ امر بھی باعثِ اطمینان ہے کہ ملک کے بعض تعلیمی ادارے نئی قومی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے مقاصد کو محض ایک سرکاری دستاویز سمجھ کر نظر انداز کرنے کے بجائے اس کی حقیقی روح کو سمجھنے اور اسے عملی جامہ پہنانے کی سنجیدہ کوشش کر رہے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اس سلسلے میں ایک نمایاں مثال کے طور پر سامنے آئی ہے۔خصوصاً شیخ الجامعہ، پروفیسر مظہر آصف کی علمی بصیرت، انتظامی صلاحیت اور مستقبل شناس قیادت نے جامعہ کو اس سمت میں قابلِ قدر پیش رفت سے ہم کنار کیا ہے۔

پروفیسر مظہر آصف نے یہ حقیقت بخوبی محسوس کی کہ نئی تعلیمی پالیسی کا اصل مقصد صرف نصاب میں تبدیلی یا نئے کورسز کا اضافہ نہیں، بلکہ ایک ایسے ہمہ جہت تعلیمی ماحول کی تشکیل ہے جہاں علم، کردار، تحقیق، اختراع، تہذیبی شعور اور قومی ذمہ داری باہم مربوط ہو جائیں۔اسی فکر کے تحت جامعہ میں بین المضامینی (Interdisciplinary) تعلیم، تحقیق کے فروغ، ہندوستانی علمی روایت کے احیاء، ہندوستانی زبانوں کی ترویج، ہنرمندی پر مبنی تعلیم اور طلبہ کی ہمہ جہت شخصیت سازی کے لیے متعدد عملی اقدامات کیے گئے ہیں، جن کے اثرات اب نمایاں طور پر محسوس کیے جا رہے ہیں۔

یہ حقیقت بھی لائقِ تحسین ہے کہ پروفیسر مظہر آصف نے تعلیمی ترقی کو اخلاقی اور تہذیبی اقدار سے الگ نہیں سمجھا۔ ان کی قیادت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جدید علوم کے ساتھ ساتھ انسانی اقدار، سماجی ذمہ

داری، قومی یکجہتی، تہذیبی شناخت اور فکری اعتدال کو بھی اپنی تعلیمی ترجیحات میں نمایاں مقام دیا ہے۔ یہی وہ متوازن نقطۂ نظر ہے جس کی نئی قومی تعلیمی پالیسی بھی وکالت کرتی ہے اور جس کی ہمارے معاشرے کو آج سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

درحقیقت تعلیم کی حقیقی کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب اس کے ساتھ اخلاق، کردار اور انسان سازی کا عمل بھی پوری قوت کے ساتھ جاری رہے، اور یہی وہ پیغام ہے جسے ہمارا موجودہ تعلیمی نظام اپنے نصب العین کا حصہ بنائے تو ایک باوقار، مہذب اور ترقی یافتہ معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی قوم کی پائیدار ترقی کا راز صرف اقتصادی استحکام، سائنسی ایجادات یا تکنیکی مہارت میں مضمر نہیں، بلکہ ایسے صالح، باکردار، ذمہ دار اور باوقار انسانوں کی تیاری میں پوشیدہ ہے جو علم کو امانت، کردار کو سرمایہ اور خدمتِ خلق کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے ہوں۔ یہی وہ پیغام ہے جسے قرآنِ حکیم، سیرتِ نبویؐ اور ہماری درخشاں علمی روایت ہمیشہ سے پیش کرتی آئی ہے اور یہی نئی قومی تعلیمی پالیسی کی روح بھی ہے کہ تعلیم انسان کی ہمہ جہت شخصیت کی تعمیر کا ذریعہ بنے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے تعلیمی اداروں، اساتذۂ کرام، اربابِ اقتدار اور پالیسی سازوں کو ایسی حکمت، اخلاص اور بصیرت عطا فرمائے کہ وہ آنے والی نسلوں کو علم و کردار، تحقیق و تہذیب اور ایمان و انسانیت کے ان اعلیٰ اقدار سے آراستہ کر سکیں، جن پر ایک مہذب، باوقار اور ترقی یافتہ ہندوستان کی مضبوط بنیاد استوار ہو سکتی ہے۔ آمین۔

ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی

پروفیسر مظہر آصف *

ایک خدا تین مذاہب: تصادم کا تاریخی سفر

مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان بداعتمادی کی اصل کہانی

پروفیسر مظہر آصف ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر، ممتاز محقق، دانشور اور ماہر تعلیم ہیں۔ وہ تعلیمی فکر، تصوف اور اسلامی مطالعات کے میدان میں اپنی گراں قدر علمی خدمات، تحقیقی کاوشوں اور فکری رہنمائی کے باعث قومی و بین الاقوامی علمی حلقوں میں ایک معتبر اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

۱۴ر جون ۲۰۲۶ء کی شب دنیا نے کم از کم کسی حد تک، اطمینان کا سانس لیا۔ یوں محسوس ہونے لگا کہ عالمی معیشت اور انسانی زندگی پر طویل عرصے سے چھائی ہوئی گھٹن اور بے یقینی کی فضا بتدریج ختم ہو رہی ہے اور لوگ اضطراب، تشویش اور مسلسل غیر یقینی صورتِ حال سے نکل کر سکون کی جانب گامزن ہیں۔ تاہم امریکہ، اسرائیل اور ایران کے درمیان کسی جامع اور حتمی معاہدے کے امکانات تاحال دور دکھائی دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

* وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۔۲۵

اس صورتِ حال کا تجزیہ کئی زاویوں سے کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ اور اسرائیل نے ایران کے خلاف جنگ صرف اس کی جوہری صلاحیتوں کو تباہ کرنے کے لیے ہی نہیں چھیڑی بلکہ اس سخت گیر حکومت کو بھی بدلنے کی کوشش کی، جو اپنے آپ کو اسلامی اصولوں کے مطابق قائم ہونے والی حکومت قرار دیتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اتنی تباہ کن جنگ چھیڑنے کے لیے یہی ایک کافی وجہ تھی؟ ایسی جنگ جس نے کئی ماہ تک عالمی معیشت کا گلا گھونٹے رکھا اور پٹرول، خام تیل اور دیگر ضروری اشیا کی قیمتوں کو اس قدر بڑھا دیا کہ دنیا بھر کے عام لوگوں کی پہنچ سے باہر ہونے لگیں۔ یہ محض جارحیت کی جنگ یا علاقائی و عالمی بالادستی کی کشمکش نہیں تھی۔ اگر ہم اس تنازع کا گہرائی سے جائزہ لیں تو اس کے پس پردہ کئی ایسے عوامل بھی نظر آتے ہیں جو عام لوگوں کی نگاہ سے اوجھل رہتے ہیں۔ ان میں ایک نمایاں سبب وہ بداعتمادی اور باہمی احترام کا فقدان ہے جو دنیا کے تین بڑے مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے بعض پیروکار مذہب اور عقیدے کے نام پر ایک دوسرے کے بارے میں رکھتے ہیں۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان تینوں سامی مذاہب کی تاریخ کا مطالعہ کریں جن کی جڑیں ایک ہی ابراہیمی روایت سے ملتی ہیں۔ اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے پیروکار سب اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے دین کے حقیقی وارث ہیں۔ یہ وہ دین تھا جس کی بنیاد وحدانیت پر قائم تھی، اسی ایک خدا کی حضرت ابراہیمؑ نے پوری زندگی عبادت کی اور اپنے ماننے والوں کو بھی یہی تعلیم دی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں کسی قسم کی شرکت یا دوئی کو ہرگز قبول نہ کیا جائے۔ وقت گزرنے کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کا دور تاریخ کا حصہ بنتا گیا اور انسانیت کی رہنمائی کے لیے مختلف ادیان اور مذہبی روایات وجود میں آئیں۔ ان میں نمایاں ترین یہودیت تھی، جو حضرت موسیٰؑ سے منسوب ہے؛ اس کے بعد عیسائیت جو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات پر مبنی ہے؛ اور آخر میں اسلام جو اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی پیروی کرتا ہے۔ بدقسمتی سے تاریخ میں جب بھی کوئی نیا مذہبی پیغام سامنے آیا، خواہ اس کے ماننے والے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ دین ہی کیوں نہ سمجھتے ہوں، اس سے پہلے موجود مذاہب کے بہت سے پیروکاروں نے اسے باطل یا من گھڑت قرار دے کر اس کی مخالفت کی۔ اسی تناظر میں یہودیت نے حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کو قبول نہیں کیا اور ان کی تعلیمات کی شدید مخالفت کی۔ عیسائی عقیدے کے مطابق یہ مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ حضرت

عیسیٰ کو قتل کرنے کی سازشیں کی گئیں، کیوں کہ انھوں نے ایسی تعلیمات پیش کیں جو اُس زمانے میں رائج یہودی تعبیرات اور اعتقادات سے مختلف سمجھی جاتی تھیں۔

تقریباً یہی صورتِ حال اسلام کے ساتھ بھی پیش آئی۔ اسے یہودیوں اور عیسائیوں، دونوں کی جانب سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی صرف اس بنا پر ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں کہ آپ ایک نئے دین اور نئے عقیدے کے داعی سمجھے گئے، حالانکہ اسلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ عبادت کا کوئی بالکل نیا تصور پیش کر رہا ہے، بلکہ اس نے خود کو اسی الٰہی روایت کا تسلسل اور اس کی تکمیل قرار دیا جو اس سے پہلے یہودیت اور عیسائیت کی صورت میں جلوہ گر ہو چکی تھیں۔ قرآنِ مجید تورات اور انجیل کی الہامی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ سمیت تمام بنیادی انبیائے کرام کے احترام کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی طرح قرآن اپنے پیروکاروں کو یہ بھی ہدایت دیتا ہے کہ وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تشریف لانے والے تمام انبیاء اور رسولوں کا احترام کریں۔ دی چلڈرن آف ابراھیم کے مصنف ایف۔ای پیٹرز اپنی معروف اور مستند کتاب میں لکھتے ہیں:

یہودیت، عیسائیت اور اسلام، تینوں ایک ہی خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ یہودی خدا کو ''یہوواہ'' (Yahweh) یا ''الوہیم'' (Elohim) کے نام سے پکارتے ہیں، عیسائی اسے ''خدا باپ'' (God the Father) کہتے ہیں، جبکہ مسلمان اسے ''اللہ'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تینوں مذاہب کا عقیدہ ہے کہ اسی ایک خدا نے انسانیت کو پیدا کیا، حضرت ابراہیمؑ سے عہد لیا، انبیائے کرام کے ذریعے اپنی ہدایات اور تنبیہات نازل فرمائیں، اور اپنی مشیت کے مطابق جزا وسزا کا نظام قائم کیا۔ اگرچہ یہ تینوں بڑے مذاہب اپنی بنیاد میں بہت سی مشترک اقدار رکھتے ہیں، تاہم عقائد، مذہبی تعلیمات، عملی روایات اور تصورِ حیات کے اعتبار سے ان کے درمیان نمایاں اختلافات بھی موجود ہیں۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ تمام آسمانی کتابیں؛ تورات، بائبل اور قرآن مجید کائنات کی تخلیق کا ذکر کرتی ہیں اور حضرت آدمؑ، حضرت حوّا، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت موسیٰ اور متعدد دیگر انبیائے کرام کے بارے میں بڑی حد تک یکساں واقعات بیان کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر، دونوں مذہبی روایات میں یہ ذکر ملتا ہے کہ حضرت سارہ اولاد سے محروم تھیں، چنانچہ انھوں نے حضرت ہاجرہ کو

حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اس امید پر رہنے کی اجازت دی کہ ان کے ذریعے حضرت ابراہیمؑ کو وارث مل جائے۔ حضرت ہاجرہ کے ہاں حضرت اسماعیلؑ کی ولادت ہوئی جو حضرت ابراہیمؑ کے پہلے صاحبزادے تھے۔ بعدازاں غیرت اور حسد کے باعث حضرت سارہ نے حضرت ہاجرہ سے حضرت ابراہیمؑ کے گھرانے سے الگ ہو جانے کا مطالبہ کیا۔ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ عرب کے ریگستان کی طرف روانہ ہوئے جہاں اللہ تعالیٰ کی مدد سے وہ محفوظ رہے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ حضرت اسماعیل ایک عظیم قوم کے جدامجد ہوں گے جسے بہت سے لوگ عرب قوم سے منسوب کرتے ہیں۔

عرب روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے مل کر مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کی تعمیر کی جسے بیت اللہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحاق کی ولادت ہوئی۔ حضرت اسحاق کی نسل کو بعد میں ''برگزیدہ قوم'' اور ''ارض موعود'' سے وابستہ سمجھا گیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ تینوں مذاہب ایک ہی تاریخی سرچشمے اور مشترک ابراہیمی روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ یہودیت اور عیسائیت کی تعلیمات میں انسانی مداخلت کے باعث بعض تبدیلیاں واقع ہوئیں اور ان کے اصل پیغام کے بعض حصے تحریف کا شکار ہو گئے۔

اسی عقیدے کی بنیاد پر قرآن مجید اور بائبل کی بعض روایات کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کی وضاحت کی جاتی ہے۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۱.٦، ارب ہے، یعنی دنیا کے ہر پانچ یا چھ افراد میں سے ایک مسلمان ہے۔ یہودیت کے پیروکاروں کی تعداد تقریباً ایک کروڑ تیس لاکھ ہے، جبکہ عیسائیت کے ماننے والوں کی تعداد تقریباً ۲.۲، ارب ہے۔ اگرچہ ان تینوں مذاہب کی اصل ایک ہے اور ان میں بے شمار مشترکہ خصوصیات پائی جاتی ہیں لیکن ان کے باہمی اختلافات اکثر اوقات دشمنی اور خونریز تنازعات کا سبب بنتے رہے ہیں۔ ان کے پیروکار نہ صرف ایک دوسرے کے مذہبی دعووں اور اعتقادی بنیادوں پر سوال اٹھاتے رہے، بلکہ اکثر اپنے آپ کو ہی اللہ تعالیٰ کے پیغام کا واحد حقیقی وارث بھی سمجھتے رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسے تصورات نے متعدد جنگوں کو جنم دیا اور مختلف مذہبی برادریوں کو دبانے اور ختم کرنے کی کوششوں کا باعث بھی بنے۔ قرآن مجید انسانی معاشرے میں ہم آہنگی، یکجہتی اور باہمی احترام کو فروغ دینے کے لیے اہل ایمان کو تمام انبیائے کرام، رسولوں اور آسمانی

کتابوں پر ایمان رکھنے اور ان کا احترام کرنے کی تعلیم دیتا ہے:

قُلْ آمَنَّا بِاللّهِ وَمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَالنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لاَ نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُون. (سورہ آل عمران:۳/۸۴)

''کہہ دیجیے! ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر بھی جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد کی طرف نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو موسیٰؑ عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے عطا کیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی ایک اللہ کے فرماں بردار ہیں۔''

مزید فرمایا:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ. (سورہ آلِ عمران:۳/۶۴)

''کہہ دیجیے اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب نہ بنائیں۔''

اسلام اور عیسائیت کے درمیان بنیادی اعتقادی اختلاف حضرت عیسیٰ کی ذات اور مقام کے حوالے سے ہے۔ قرآن مجید تثلیث (ٹرینیٹی)، حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت یا اللہ کے بیٹے ہونے کے عقیدے اور مصلوب کیے جانے کے اس تصور کو، جسے عموماً مرکزی دھارے کی عیسائی الٰہیات میں تسلیم کیا جاتا ہے، واضح طور پر رد کرتا ہے:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لاَ تَغْلُواْ فِي دِينِكُمْ وَلاَ تَقُولُواْ عَلَى اللّهِ إِلاَّ

الْحَقِّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ فَآمِنُواْ بِاللّهِ وَرُسُلِهِ وَلاَ تَقُولُواْ ثَلاَثَةٌ انتَهُواْ خَيْراً لَّكُمْ إِنَّمَا اللّهُ إِلَـهٌ وَاحِدٌ سُبْحَانَهُ أَن يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَات وَمَا فِي الأَرْضِ وَكَفَى بِاللّهِ وَكِيلاً. (سورہ النساء:۴/۱۷۱)

''اے اہل کتاب تم اپنے دین میں حد سے نہ نکلو اور اللہ کی شان میں سوائے پکی بات کے نہ کہو۔ بے شک مسیح عیسیٰ، مریم کا بیٹا اللہ کا رسول ہے اور اللہ کا ایک کلمہ ہے جسے اللہ نے مریم تک پہنچایا اور وہ اللہ کی طرف سے ایک جان ہے۔ سو اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ خدا تین ہیں۔ اس بات کو چھوڑ دو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ بے شک اللہ اکیلا معبود ہے۔ اللہ اس سے پاک ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو اور اسی اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے اور اللہ کارساز کافی ہے۔''

اسی طرح قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّهِ وَقَالَتْ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّهِ ذَلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِؤُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُواْ مِن قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّهُ أَنَّى يُؤْفَكُونَ.(سورہ التوبہ:۹/۳۰)

''اور یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں یہ محض ان کے منہ کی باتیں ہیں وہ کافروں کی سی باتیں بنانے لگے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ انھیں ہلاک کرے یہ کہاں بہکے جا رہے ہیں۔''

قرآن مجید یہ بھی بیان کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو نہ قتل کیا گیا اور نہ ہی صلیب پر چڑھایا گیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی طرف اٹھالیا:

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللّهِ وَمَا

قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَكِن شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُواْ فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اِتِّبَاعَ الظَّن،وَمَا قَتَلُوهُ يَقِيْناًo بَل رَّفَعَهُ اللّهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللّهُ عَزِيْزاً حَكِيْما. (سورہ نساء:۴/۱۵۸-۱۵۷)

''اوران کے اس کہنے پر کہ ہم نے مسیح عیسیٰ مریم کے بیٹے کوقتل کیا جواللہ کا رسول تھا حالانکہ انھوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا لیکن ان کو اشتباہ ہو گیا اور جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں۔ان کے پاس بھی اس معاملے میں کوئی یقین نہیں ہے۔محض گمان ہی کی پیروی کی ہے انھوں نے۔یقیناً مسیح کوقتل نہیں کیا۔ بلکہ اسے اللہ نے اپنی طرف اٹھالیااوراللہ زبردست حکمت والا ہے۔''

اگرچہ یہودیت اوراسلام،دونوں خالص توحید کےعقیدے پرزور دیتے ہیں،تاہم قرآن مجید بعض بنیادی امور میں رائج یہودی مذہبی تصورات سے اختلاف کرتا ہے۔قرآن حضرت عیسیٰؑ کومسیح تسلیم کرتا ہے،نسل یانسب کی بنیاد پرکسی قوم کی دائمی برتری کےتصورکوردکرتا ہے،اوربعض ایسی تعلیمات پرتنقید کرتا ہےجنھیں وہ اصل الٰہی پیغام سےانحراف قرار دیتا ہے۔اسی تناظر میں قرآن مجید میں ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاء بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللّهَ لاَ يَهْدِيْ الْقَوْمَ الظَّالِمِيْن(سورہ المائدہ:۵/۵۱)

''اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کواپنا سرپرست اورراز دار نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے حامی ہیں۔اورتم میں سے جوکوئی ان سے دوستی کرے گا،وہ انہی میں شمار ہوگا۔بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

مسلمانوں،عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان کشیدگی حالیہ واقعات کانتیجہ نہیں ہے، بلکہ ان کی مشترکہ تاریخ، باہمی کشمکش،جنگوں اورتشدد کے ایسے ادوار سے عبارت ہے،جنھوں نے بے شمار انسانی جانوں کومتاثر کیا۔مصنف کے مطابق،۱۹۴۸ءمیں فلسطینی سرزمین پرعرب آبادی کے درمیان اسرائیل کے قیام اور بعدازاں ۱۹۶۷ءکی عرب۔اسرائیل جنگ نے ان اختلافات کومزید گہرا کردیا،جس کے

نتیجے میں مزید علاقوں پر قبضے ہوئے، جن میں شام کی جولان کی پہاڑیاں بھی شامل ہیں، جن کی حیثیت آج بھی متنازع ہے۔ حالیہ برسوں میں خصوصاً غزہ کے بحران اور ایران، امریکہ اور اسرائیل سے متعلق وسیع تر جغرافیائی و سیاسی تنازعات کے دوران یہ خلیج مزید نمایاں ہوگئی ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان تنازعات کو اکثر مذہبی بیانیوں کے ذریعے بیان اور جواز فراہم کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات سیاسی رہنما اور ریاستی ادارے مذہبی زبان اور اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے ان جنگوں کو اخلاقی طور پر درست یا حتیٰ کہ خدا کی مرضی کے مطابق قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرزِ فکر نے بعض مواقع پر سیاسی اور جغرافیائی تنازعات کو تہذیبی یا مذہبی تصادم کی صورت دے دی ہے۔ اس صورت حال کا ایک نہایت اہم اور تشویش ناک پہلو یہ بھی ہے کہ مختلف مذہبی گروہ موجودہ تنازعات کو آخرت یا اختتامی زمانے سے متعلق اپنے عقائد کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ واقعات آخری الٰہی فیصلے یا قیامت کے قریب آنے کی نشانیاں ہوسکتے ہیں۔ ہر مذہبی روایت اپنی اپنی مقدس کتابوں کی تعبیر کی بنیاد پر بعض اوقات ان کشمکشوں کو ایک وسیع تر مقدس اور مذہبی بیانیے کا حصہ سمجھتی رہی ہے۔

اس کے نتیجے میں ان تینوں مذہبی روایات کے درمیان موجود اختلافات اور مشترکہ پہلوؤں کے بارے میں عوامی سطح پر اب بھی ایک نمایاں خلا پایا جاتا ہے۔ خود ان مذاہب کے بہت سے پیروکار بھی اکثر مکمل اور گہری معلومات سے محروم ہوتے ہیں اور ان کی سمجھ بوجھ زیادہ تر تنقیدی مطالعے اور سنجیدہ تحقیق کے بجائے موروثی روایات اور رائج تصورات پر استوار ہوتی ہے۔ جہاں تک ان مذاہب سے باہر تعلق رکھنے والے افراد، مثلاً بدھ مت سکھ مت یا ہندو مت کے ماننے والوں کا تعلق ہے، ان کے لیے ان مذہبی روایات کی پیچیدگیوں کو سمجھنا مزید دشوار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وقت کا تقاضا ہے کہ ان مذاہب کی بنیادی تعلیمات کا مطالعہ صرف مذہبی یا اعتقادی نقطۂ نظر سے ہی نہیں، بلکہ سیاسی، سماجی اور معاشی تناظر میں بھی کیا جائے۔ آج کے دور میں ان میں سے بہت سے تنازعات مذہبی اختلافات سے زیادہ سیاسی اور معاشی مفادات کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ حکمران اور سیاسی قائدین اکثر اپنے اقدامات کو مذہبی زبان، علامات اور بیانیے کے ذریعے جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے رجحانات کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے اور لوگوں کو اس بات کی ترغیب دی جانی چاہیے کہ وہ ان اختلافات، ان کے تاریخی پس منظر اور محدود یا تنگ نظر تعبیرات کے نتائج کو اپنے علم وفہم اور تنقیدی بصیرت کی روشنی میں زیادہ واضح اور معروضی انداز سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

پروفیسر عبیداللہ فہد فلاحی *

تفسیر الکشّاف پر تحقیق وتنقید

(پروفیسر فضل الرحمٰن گنّوری اور مصطفیٰ الصّاوی الجوینی کا تقابل)

پروفیسر فضل الرحمٰن (۱۹۳۰-۲۰۱۳ء) اتر پردیش میں علی گڑھ سے ساٹھ کلومیٹر دور قصبہ گنّور ضلع سنبھل میں پیدائش کی وجہ سے گنّوری کی علاقائی نسبت سے معروف بڑے بارعب اور صاحب طنطنہ عالم تھے۔ انھوں نے کسی درس گاہ میں عربی زبان وادب کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر اپنے معاصر پروفیسر ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی (۱۹۳۵-۲۰۲۲ء) اور پروفیسر فضل الرحمٰن فریدی (۱۹۳۲-۲۰۱۱ء) کی طرح ذاتی شوق اور علمی وابستگی کی بدولت عربی زبان میں اتنی دست گاہ بہم پہنچائی تھی کہ جامعہ امام محمد بن سعود ریاض سعودی عرب میں آگے چل کر شعبۂ اصول دین میں آپ کا تقرر پروفیسر کی حیثیت سے ہوا تو عربی زبان میں عرب طلبہ کو آپ نے پڑھایا۔[1]

صدر شعبہ سنّی دینیات اور ۱۹۸۲-۱۹۸۳ء میں دینیات فیکلٹی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈین کی حیثیت سے شعبہ اور فیکلٹی کی ترقی میں انھوں نے سرگرم کردار ادا کیا۔ اُسی دور میں ۱۹۸۲ء میں اُن کی پی ایچ ڈی کا مقالہ شائع ہوا۔ ۱۹۷۱ء میں انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔ موضوع تھا: An

* سابق پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ   ای میل: fahad.is@amu.ac.in

Analytical Study of Al-Zamakhshari's Commentary on the Quran(زمخشری کی تفسیر الکشاف - ایک تحلیلی جائزہ)[۲]

ایک دوسری علمی بحث ''تجارتی سود-تاریخی اور فقہی نقطۂ نظر سے'' مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی کی تصنیف ''کمرشیل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت'' پر تنقید ہے۔ یہ کتاب ماہنامہ برہان دہلی کے مدیر پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی (۱۹۰۸-۱۹۸۵ء) کی خدمت میں تبصرہ کے لیے بھیجی گئی تھی، فاضل مدیر نے یہ کام اپنے رفیق شعبہ پروفیسر گنّوری سے لیا کیوں کہ وہ قانون میں بھی ایم اے تھے اور امہات فقہ پر اُن کی نظر تھی۔ اس کتاب میں پروفیسر گنّوری کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ بھی شامل ہے: A Study of Commercial Interest in Islam علی گڑھ یونیورسٹی نے اس کتاب کو ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔[۳]

پروفیسر گنّوری کی ایک تیسری کتاب ''کتاب الٰہی کے پانچ مطالبات'' دعوتی واصلاحی نوعیت کی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے قرآن مجید کے اپنے قارئین سے پانچ مطالبات کا تذکرہ کیا ہے:

(۱) ایمان بالقرآن (۲) تلاوت قرآن

(۳) تدبر قرآن (۴) عمل بالقرآن

(۵) تبلیغ قرآن[۴]

پروفیسر گنّوری سے ذاتی راہ ورسم کی وجہ اُن کی عربی دانی، غیر مصالحانہ اسلامی فکر اور خوش باشی وخوش طبعی تھی۔ وہ جماعت اسلامی ہند کی رکنیت سے مستعفی ہو چکے تھے مگر اُن کی ٹھیٹھ دین داری، بے آمیز تصورِ اسلام اور علم وادب سے شیفتگی نیز نوآموز طالبانِ علم کی تحسین شباب پر تھی۔ اس راہ میں اُن کا صدر شعبہ اور ڈین فیکلٹی ہونا کبھی حجاب نہ بنا۔ مجھے ذاتی طور پر کئی تجربے ہوئے جو میری فکری وعلمی زندگی کے لیے مہمیز ثابت ہوئے۔

اخوانی ادبیات کا ترجمہ

اسلامی طلبہ تحریک کے مرکزی دفاتر جنوری ۱۹۸۲ء میں ذاکر نگر نئی دہلی کی تعمیر شدہ عمارت میں منتقل ہوئے تو راقم کے مستقبل کا سوال اٹھا۔ ۱۹۸۱ء میں شعبہ سیاسیات بی اے، مسلم یونیورسٹی، علی

گڑھ میں داخلہ تو ہو گیا تھا مگر ذاتی اخراجات کی تکمیل کے لیے میں نے علی گڑھ میں واقع مرکزی دفتر میں سکریٹری جنرل برادر امان اللہ خاں کا معاون بن کر چار سو روپے کا وظیفہ منظور کرالیا تھا۔ اسی سے کفاف کی زندگی گزر رہی تھی۔ اب میرے سامنے دو ہی راستے بچے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں اپنا داخلہ منتقل کرالوں اور مرکزی دفتر میں جز وقتی کام کر کے فکر معاش سے آزادی حاصل کرلوں یا علی گڑھ میں قیام وتعلیم کے اخراجات کا انتظام کروں۔

برادر امان اللہ خاں نے مشکل کشائی کی۔ مولانا شمیم احمد بستوی اسلامک نرسری اینڈ پرائمری اسکول بالائے قلعہ علی گڑھ اُنھیں ''ادارہ حلِ مشکلات'' کہا کرتے تھے۔ تحریک اسلامی سے اُن کی وابستگی اور وفاداری ہمیشہ شکوک وشبہات سے بالاتر رہی اور خدمت خلق کے جذبے سے وہ سرشار رہے۔ وہ **الاتحاد الاسلامی العالمی للمنظمات الطلابیة** کویت کے معاون سکریٹری جنرل تھے۔ انھوں نے اخوان المسلمون کے رہنماؤں کی عربی کتابوں کے اردو ترجمہ کی پیش کش میرے سامنے رکھی کہ اس سے معاشی کفالت بھی ہوگی اور علمی زندگی کے مراحل بھی طے ہوتے رہیں گے۔[۵]

گریجویشن کی تکمیل کے دوران راقم نے کئی کتابوں کا ترجمہ کیا جو رفتہ رفتہ بعد میں شائع ہوئیں:

۱۔ آسان تجوید، عبدالوارث سعید کی عربی کتاب **تیسیر التجوید مع شرائط للتدریب، دار البحوث الاسلامیة**، کویت

۲۔ اخوان المسلمون کا تربیتی نظام، یوسف القرضاوی کی کتاب **التربیة الاسلامیة و مدرسة حسن البنّا**، ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی ۱۹۸۲ء

۳۔ اسلام کی بنیادیں، حسن ایوب کی کتاب **تبسیط العقائد الاسلامیة**، ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی ۱۹۸۲ء

۴۔ اسلامی حکومت- حقوق وفرائض، عبدالکریم زیدان کی کتاب **الفرد والدولة فی الشریعة الاسلامیة**، ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی، مارچ ۱۹۸۲ء

۵۔ اسلامی کردار، محمد الغزالی کی کتاب **خلق المسلم**، ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی، مئی ۱۹۸۲ء

۶۔ تحریک اور دعوت، محمد البہی الخولی کی کتاب **تـذکرۃ الدّعاۃ،دار القرآن الکریم للعنایۃ بطبعہ و نشر علومہ**، بیروت،۱۹۸۳ء

۷۔ اخوان المسلمون-مقصد،مراحل،طریق کار، پروفیسر سعید حوّیٰ کی **کتـاب فـی آفـاق التعالیم**، ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی، مارچ ۱۹۸۲ء

۸۔ تحریک اسلامی-مشکلات،مسائل،آزمائشیں،استاد فتحی یکن کی کتاب **مشـکـلات الدّعوۃ و الدّاعیۃ**، ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی،۱۹۸۳ء[۶]

راقم عنفوان شباب تھا اور عربی سے اردو میں ترجمہ کا آغاز۔ اس مرحلے میں دو بزرگوں نے مسیحائی کی:

۱۔مولانا سلطان احمد اصلاحی (۱۹۵۰-۲۰۱۶ء)[۷]

۲۔ پروفیسر فضل الرحمٰن گنوری

مولانا اصلاحی سے بے تکلفی تھی۔ اُن کے ہاں آمدورفت کے لیے آداب وقواعد کی ضرورت نہ تھی۔ پروفیسر گنوری بڑے طنطنہ اور علمی شوکت کے حامل تھے مگر پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی، پروفیسر فضل الرحمٰن فریدی اور مولانا سید جلال الدین عمری ۱۹۳۵-۲۰۲۲ء) کی مجلسوں میں اُن کا چرچا ہوتا تھا اس لیے بوقت ضرورت اُن کے ہاں بھی حاضری ہوتی تھی البتہ اس حاضری پر ادب اور رسمی تکلفات کا غلبہ ہوتا تھا۔ عربی سے اردو ترجمہ کرتے وقت مشکل مقامات کے حل کے لیے بسا اوقات اُن سے مشاورت ناگزیر ہوجاتی۔

پروفیسر سعید حوّیٰ کی کتاب زیرِ ترجمہ تھی۔ میں ایک مقام پر آکر ٹھہر گیا۔ اخوان المسلمون کی خارجہ پالیسی زیر بحث تھی۔ ترجمہ تو میں نے کرلیا مگر مفہوم کے سلسلے میں اشکال پیدا ہوا۔ کیا اسلامی تحریک کے لیے اِس طرح کی پالیسی روا ہوسکتی ہے۔ فاضل مصنف نے لکھا تھا:

> ’’ہم اپنی خارجہ پالیسی اس اصول پر مرتب کرتے ہیں کہ جو ہمارے مفادات کا خیال رکھے گا ہم اُس کے مفادات کا لحاظ کریں گے۔ یعنی مفادات کے بدلے مفادات کا حصول ہمارے پیش نظر ہوگا لیکن اگر کوئی حکومت اس سے آگے بڑھ کر ہمارے ساتھ معاملہ کرنا چاہے یعنی ہمیں

اپنے مفادات کی خاطر کچھ اصول قربان کرنے پڑیں تو عظیم تر مفاد یعنی
اسلام کی توسیع واشاعت کے لیے ہم اس کو بھی گوارا کرلیں گے۔''[۸]

میں نے پروفیسر گنّوری کی خدمت میں یہ عبارت پیش کی اور اپنی الجھن بیان کی تو انھوں نے مشورہ دیا کہ اس پر حاشیہ بڑھا دیجیے تا کہ اردو قارئین کو غلط فہمی نہ ہو۔ میں نے اُن کے مشورہ سے درج ذیل حاشیہ کا اضافہ کیا:[۹]

''یہاں غالباً مصنف اضطراری حالت کی بابت گفتگو کررہے ہیں یعنی کوئی ایسی صورت حال پیش آجائے جس میں عظیم تر مفاد کے لیے کچھ نرمی اور لچک پیدا کرنی پڑے تو اس کو گوارا کرلیا جائے مثال کے طور پر عالمی بنک سے کسی مسلم ملک کو قرض لینا ہے تا کہ ملکی معیشت آگے بڑھے تو اسے بہ کراہت سود لینا پڑے گا ورنہ ملک معیشت کے میدان میں بہت پیچھے رہ جائے گا۔ غالباً مصنف کا اشارہ اِسی طرف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔''
(مترجم)[۱۰]

کلامی فرقوں کی شمولیت

اسی طرح استاد حسن ایوب کی کتاب **تبسیط العقائد الاسلامیة** کا ترجمہ مکمل ہوا تو میں نے اپنی ایک الجھن اُن کے سامنے رکھی۔ کتاب کے آخر میں ضمیمے کا اضافہ تھا جس میں اہم اسلامی فرقوں کی مختصر تاریخ اور کلامی مسائل میں ابھرنے والے اولین دور کے اختلافات کے پس منظر پر مفصل گفتگو تھی۔ خوارج، مرجیئہ جبریہ، قدریہ، معتزلہ، اہل السنہ، شیعہ، زیدیہ، امامیہ، اثناعشریہ، اسماعیلیہ، نصیریہ، بابیہ، بہائیہ اور قادیانیت جیسے فرقے اور اُن کے عقائد زیر بحث آئے تھے۔ کتاب اسلام کے بنیادی عقائد پر مشتمل تھی۔

اُس کے موضوعات تھے: اسلامی ثقافت، علم عقائد، خدائی صفات، قضا وقدر، رسالت، معجزہ، قرآن کا اعجاز، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی صفات، وحی، اولیا اور کرامت، غیب پر ایمان، توحید کے منافی اعمال ونظریات، عقائد اور عبادات کا باہمی رشتہ اور عقیدہ واخلاق سے عام قارئین کو اسلام کی

بنیادی تعلیمات سے روشناس کرانا مقصود تھا۔ مصنف نے خود مقدمے میں صراحت کی تھی کہ اُن کے سامنے اسلامی عقائد پر جامع گفتگو کرنا پیش نظر ہے:

> ''اس میں ایک طرف کتاب وسنت سے قطعی اور مستحکم نصوص دیے گئے ہیں تو دوسری طرف قدیم وجدید علمی وعقلی دلائل کا وافر ذخیرہ بھی اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ کتاب کی ترتیب میں آسان اور عام فہم اسلوب پیش نظر رہا ہے تا کہ ہر قاری اِن مسائل کا ادراک کر سکے اور جن اصولوں اور علوم کا تذکرہ اس میں موجود ہے اُن پر سنجیدگی سے غور کر سکے اور کسی غلطی اور اشتباہ کا شکار ہوئے بغیر ان موضوعات کو اپنے خاندان اور معاشرے کے سامنے پڑھ کر سنا سکے۔''[۱۱]

کتاب کے جو عظیم الشان مقاصد تھے اُن کے پیش نظر اسلامی کلامی فرقوں کا ضمیمہ نامناسب اور بے جوڑ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے پروفیسر فضل الرحمٰن گنّوری سے پھر رابطہ کیا اور فاضل مصنف کی یہ تحریر بھی پڑھ کر سنائی کہ دورِ عباسی میں عقائد پر طول طویل بحثیں ہوئیں اور اُس نے ایسا رنگ پکڑ لیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانہ میں ناپید تھا۔ ان بحثوں میں شدت پیدا ہوئی تو ایک نیا علم وجود میں آیا جسے علم کلام یا علم توحید کا نام دیا گیا۔ میں نے پروفیسر گنّوری کے سامنے اِس نئے علم کی نشو ونما کے وہ داخلی وخارجی اسباب بھی پڑھ کر سنائے جو فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں تحریر کیے تھے۔ داخلی عوامل درج ذیل تھے:

۱۔ قرآن کے اسلوب استدلال سے متاثر ہوکر مسلمان علماء کا مخالفینِ اسلام کو جواب دینا۔
۲۔ فتوحات سے فراغت کے بعد بحث وجدال کی گرم بازاری۔
۳۔ سیاسی مسائل میں اختلاف کی وجہ سے عقائدی مسائل میں بھی اختلاف کا ظہور۔

فاضل مصنف حسن ایوّب نے علم کلام کے ظہور کے خارجی اسباب بھی شمار کرائے تھے۔

(۱) یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور صابئیت سے نکل کر اسلام کے دائرہ میں داخل ہونے والے نومسلموں کا اپنے قدیم عقائد سے وابستہ رہنا اور انھیں اسلام کے لبادہ میں پیش کرنا۔

(۲) فلسفہ اور عقلی استدلال کی تکنیک سیکھ کر معتزلہ کے نزدیک دین کا دفاع کرنا۔

(۳) متکلمین اسلام کا یونانی فلسفہ ومنطق کا مطالعہ اور اُن کی تردید میں اقدام۔[۱۲]

پروفیسر گنوری ہندوستانی مسلمانوں کے مزاج شناس تھے اور دینی واصلاحی ادب کی نزاکتوں کے شناور بھی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ کلامی فرقوں پر مشتمل ضمیمہ کتاب سے نکال دیا جائے تو اس کی افادیت دو چند ہوجائے گی۔ ان مباحث کی اہمیت تاریخ اسلام میں ابھرنے والے مختلف رجحانات کے مطالعہ وتحقیق تک محدود ہے۔ تاہم عام مسلمانوں کی دینی وفکری تربیت کے لحاظ سے یہ زیادہ اہم نہیں ہے مگر ترجمہ پروجیکٹ کے مدیرِاعلیٰ کو ہماری اس مشترکہ سفارش سے اتفاق نہ ہوسکا۔ پاکستان میں یہ کتاب شائع ہوئی تو ناشر نے اِن مباحث کو آخری صفحات سے خارج کردیا۔ ابتدائی صفحات میں کہیں اس کی صراحت بھی نہیں کی جو علمی دیانت کی خلاف ورزی تھی۔ طرفہ تماشا یہ ہوا کہ فہرست میں ''عرضِ ناشر'' اور ''چند اہم اسلامی فرقے'' کے عنوانات موجود ہیں جب کہ متن کتاب سے وہ غائب ہیں۔[۱۳]

بے محابا تبصرہ

۲۴؍فروری ۲۰۲۵ء کو ادارہ علوم القرآن شبلی باغ علی گڑھ میں منعقد ہونے والے علمی مذاکرہ کے معاً بعد سوالات وملاحظات کے وقفے میں پروفیسر محمد راشد اصلاحی، شعبہ دینیات سُنّی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے پروفیسر فضل الرحمٰن گنوری کی تحقیق انیق ''زمخشری کی تفسیر الکشّاف-ایک تحلیلی جائزہ'' کو عرب اسکالر مصطفیٰ الصّاوی الجوینی (ماجستر فی الادب مصر) کی عربی کتاب **منهج الزمخشری فی تفسیر القرآن وبيانِ إعجازه** کا چربہ قرار دیا تو مجھے سخت افسوس ہوا۔ میں نے اُسی وقت نکیر کی اور پروفیسر اصلاحی سے مثبت طرزِ گفتگو کی درخواست کی۔

دوتین دن گزرے تو میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کی لائبریری گیا۔ دونوں کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھیں اور مجھے پروفیسر محمد راشد اصلاحی کی باتوں میں صداقت نظر نہ آئی۔ انھوں نے دوبارہ فون کیا اور اپنے موقف کی تصویب چاہی۔ میں نے اُن کی تائید نہیں کی۔

ماہِ رمضان ۱۴۴۶ھ کا آخری عشرہ تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ ادارہ علوم القرآن کے مذاکرہ علمیہ میں جو گفتگو میں نے کی تھی، اسے افادۂ عام کے لیے مرتب کردوں۔ پروفیسر اصلاحی میرے ہم جماعت

ڈاکٹر طفیل احمد فلاحی کے برادرِخورد ہونے کی وجہ سے مجھے ہمیشہ عزیز رہے، تاہم یونیورسٹی اور شعبہ کی سیاست میں متحرک رہنے کی وجہ سے اُن کا وہ علمی وفکری ارتقا نہ ہوسکا جو مدرسۃ الاصلاح کے ایک ہونہار فرزند سے مطلوب تھا۔ اِس لیے مجھے پروفیسر گنوری پر اُن کا بے محابا تبصرہ صائب نہ لگا۔ لیکن اب دونوں کتابوں کے تقابلی مطالعہ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے ندامت ہوئی کہ پروفیسر اصلاحی کی سیاسی وسماجی مصروفیات کا منفی پہلو ہی میرے ذہن پر غالب رہا۔ شیخ سعدی نے صحیح کہا ہے:

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

قرآن نے بدگمانی سے منع کیا ہے، اس میں بڑی حکمتیں ہیں۔ انسانوں سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے اور اُن کے متعلق دل میں گمان بھی پیدا ہوتا ہے جو ایک فطری بات ہے مگر اس معاملے میں سہل نگاری یا بے پروائی بڑے خطرناک نتائج کا سبب بن جاتی ہے۔ وصل کی جگہ فصل کے اسباب نمودار ہونے لگتے ہیں۔ قرآن نے حکم دیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيراً مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ○
(الحجرات:۱۲)

اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو کیوں کہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ (۱۹۰۴-۱۹۹۷ء) نے بڑی خوبصورت مثال دی ہے۔ گمانوں کے شوقین کی مثال اُس شکاری کی ہے جو مچھلیاں پکڑنے کے شوق میں ایسا اندھا ہوجاتا ہے کہ مچھلیاں پکڑتے پکڑتے سانپ بھی پکڑ لیتا ہے۔ ایسا شخص مچھلیاں پکڑنے کے شوق میں کسی دن اپنی زندگی ہی گنوا بیٹھتا ہے۔[۱۴]

علامہ زمخشری کی عقلی تفسیر

پروفیسر گنوری اور مصطفٰی الصاوی الجوینی کی تحقیقات کا تقابل ایک دلچسپ موضوع ہے جس سے الکشاف کے تجزیاتی مطالعہ کی راہیں کھلتی ہیں۔ پروفیسر گنوری نے امام زمخشری کی ایک تکنیک عقلی

توجیہات کوقرار دیا ہے جس کے ذریعہ مفسرآیت کے ظاہری معنی اورمعتزلہ کے اصولوں کے درمیان واقع تضاد کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔سورہ اعراف میں معتزلہ کے اصول عدل وخلق افعال سے تصادم نظر آتا ہے توامام زمخشری عقلی تاویل سے کام لے کراس تضاد کو رفع کرتے ہیں:

سَأَصْرِفُ عَنْ ءايَتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ إِن يَـرَوْا كُلَّ ءَ ايَةٍ لَّايُؤْمِنُواْ بِهَا وَ إِن يَرَوْاْ سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّـخِـذُوْهُ سَبِيْلاً وَ إِن يَـرَوْاْ سَبِيْـلَ الْـغَـيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلاً ۚ ذٰلِكَ بِـأَنَّهُـمْ كَـذَّبُـواْ بِـئـايَتِـنَـا وَكَـانُـواْ عَـنْهَـا غٰفِلِيْنَ٥ (الأعراف:۱۴۶)

میں اپنی نشانیوں سے اُن لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں، وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اُس پر ایمان نہ لائیں گے، اگر سیدھا راستہ اُن کے سامنے آئے تو اُسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے، اس لیے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور اُن سے بے پروائی کرتے رہے۔

اس آیت میں سَأَصْرِفُ عَنْ ءايَتِيَ میں خدائی نشانیوں سے کافروں کی نگاہیں پھیرنے کا انتساب اللہ کی جانب ہے اور یہ خلق افعال اور عدل الٰہی کے معتزلہ نظریہ کے خلاف ہے۔اس سے اُن کے حریت ارادۂ انسانی کے نظریہ پر ضرب پڑتی ہے۔امام زمخشری کہتے ہیں کہ **صرف عن الآیات** کا یہ عمل کافروں کے خذلان اور دلوں کی قفل بندی کا ذریعہ ہے جو خود اُن کے افعال کا نتیجہ ہے کیوں کہ یہ لوگ آیات الٰہی پر تدبر کرنے اور اُن سے عبرت حاصل کرنے کی جگہ اپنی خواہشات نفسانی میں بدمست رہتے ہیں۔

اس آیت کی ایک ممکن تاویل زمخشری نے یہ بیان کی ہے کہ زمین میں تکبر کرنے والے کفار کو اللہ تعالیٰ روک دیتا ہے کہ وہ آیات الٰہی کا ابطال اور اُن کی تردید کرسکیں۔جس طرح اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں فرعون کی ساری کوششوں اور سازشوں کو باطل کردیا تھا اور باطل کے مقابلے میں حق کو غالب کیا تھا۔جادوگروں کے سارے کرشمے ناکام ہوگئے تھے۔

اس آیت کی تفسیر یہ بھی ممکن ہے کہ آیاتِ الٰہی سے کافروں کی نگاہیں پھیرنے کا مطلب یہ ہو کہ انھیں ہلاک کر دیا جائے گا۔ گویا یہ ایک تنبیہی آیت ہے اور مخالفین کو اُن کے بُرے انجام سے ڈرایا گیا ہے۔[۱۵]

پروفیسر گنّوری کی یہ پوری بحث مصطفیٰ الصاوی الجوینی سے مستعار ہے۔ مصری مصنف نے امام زمخشری کی تکنیک بیان کی ہے:

> زمخشری مسلک اعتزال کی خدمت کے لیے ایک آیت کے مختلف معانی اور تاویلات بیان کرنے میں منطقی مہارت اور فکری ریاضت کا استعمال کرتے ہیں تا کہ اس فکری و عقلی ورزش سے معتزلہ کے نظریہ کو ثابت کر سکیں۔‘‘[۱۶]

اس کے بعد پوری بحث وہی آتی ہے جس کا تذکرہ اوپر ہوا ہے۔

اختلافِ قرأت سے فائدہ اٹھانا

پروفیسر گنّوری نے الکشاف کے اعتزالی منہج کی دوسری تکنیک مختلف قرأتوں سے استفادہ کو قرار دیا ہے۔ قرآن اعلان کرتا ہے:

> **شَهِدَ اللّهُ أَنَّهُ لاَ إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ وَالْمَلاَئِكَةُ وَأُوْلُواْ الْعِلْمِ قَآئِمَاً بِالْقِسْطِ لاَ إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللّهِ الإِسْلاَمُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوْتُواْ الْكِتَابَ إِلاَّ مِن بَعْدِ مَا جَاءهُمُ الْعِلْمُ بَغْياً بَيْنَهُمْ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللّهِ فَإِنَّ اللّهِ سَرِيعُ الْحِسَاب ۝** (آلِ عمران: ۱۸، ۱۹)
>
> اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور (یہی شہادت) فرشتوں اور سب اہلِ علم نے بھی دی ہے۔ وہ انصاف پر قائم ہے۔ اُس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اِس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے اُن لوگوں نے اختیار کیے جنھیں کتاب دی گئی تھی، اُن کے اس طرزِ عمل کی

کوئی وجہ اِس کے سوا نہ تھی کہ انھوں نے علم آ جانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا اور جو کوئی اللہ کے احکام وہدایات کی اطاعت سے انکار کردے، اللہ کو اُس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

زمخشری نے اِن آیات میں **اُولوا العلم** سے مراد معتزلہ اصحاب علم کو لیا ہے: ''یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو محکم دلائل اور مضبوط استدلال سے اللہ کی وحدانیت اور اُس کے عدل کا اثبات کرتے ہیں یعنی عدل وتوحید پر ایمان رکھنے والے علمائے اسلام۔'' اس کے بعد وہ قرأتوں کے اختلاف سے بحث کرتے ہیں۔ ایک قرأت تو یہی ہے جس کے مطابق ترجمہ ہوا ہے یعنی **أنّه** کو فتحہ سے، **إنّ الدّين** کو کسرہ سے پڑھا جاتا ہے اور فعل **شَهِدَ أنَّه** پر واقع ہوتا ہے۔ اس قرأت میں **إنّ الـدِّيـنَ عِندَ اللّٰه الإسـلام** جملہ مستأنفہ ہے اور جملہ اولیٰ کی تاکید ہے۔ اس تاکید سے **لا إلــه إلّا هُـوَ** کے ٹکڑے سے توحید اور **قائماً بالقِسط** سے عدل کا اصول ثابت ہوتا ہے۔ ان دونوں بنیادی نظریاتِ اعتزال کے بعد **إنّ الـدِينَ عِندَ اللّٰهِ الاسلام** کہہ کر اعلان کر دیا گیا کہ دین اسلام عدل وتوحید کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں پہنچ کر علامہ زمخشری یہ صراحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ماورائے معتزلہ یعنی اہلِ سنت دین اسلام پر قائم نہیں ہیں:

> ''اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ کے تئیں تشبیہ کا عقیدہ رکھتے ہیں یا جبر کے نظریہ کو، جو محض ظلم ہے، درست مانتے ہیں وہ اللہ کے دین اسلام پر قائم نہیں ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ بات بالکل واضح ہے۔''

زمخشری ایک دوسری قرأت کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ اس کے مطابق **أنّــه لا الٰـه اِلّا هُوَ** بھی مفتوح ہے اور **أنَّ الدِّينَ عِندَ اللّٰه الإسلامُ** بھی فتحہ کی حالت میں ہے۔ اِس قرأت کے مطابق دوسرا جملہ پہلے جملے کا بدل ہوگا۔ یہ بات معلوم ہے کہ بدل اور مُبدل منہ میں معنی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی گواہی توحید پر ہے اور اس بات پر بھی کہ دین صرف اسلام ہے۔ اس سے صراحت ہوگئی کہ دین اسلام صرف توحید اور عدل کا نام ہے۔

ایک تیسری قرأت کے مطابق **إنه لا إلٰه إلّا هُو** کو کسرہ کے ساتھ اور **أنّ الدّينَ عندَ اللّٰه**

الإسلامُ میں أنّ کوفتحہ کے ساتھ پڑھا جائے جس میں فعل شَھِدَ کا وقوع أنَّ پر ہو اور دونوں کے درمیان واقع ہونے والے کلام کو اعتراض مؤکّد مان لیا جائے۔ اس صورت میں بھی مطلب وہی ہوگا کہ دین اسلام عدل اور توحید کا نام ہے۔[۱۷]

یہ بحث من وعن مصطفیٰ الصّاوی الجوینی سے ماخوذ ہے۔ البتہ مصری مصنف نے ایک اور آیت سے استدلال کیا ہے جسے پروفیسر گنّوری نے چھوڑ دیا ہے۔ وہ آیت شفاعت سے متعلق ہے:

وَاتَّقُواْ يَوْماً لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئاً وَلاَ يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلاَ يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلاَ هُمْ يُنصَرُونَ ٥(البقرہ:۴۸)

اور ڈرو اُس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا، نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی، نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔

زمخشری کہتے ہیں کہ حضرت قتادہ کی قرأت فعل معروف کی ہے یعنی لا یقبلُ منها شَفاعةً جس میں فاعل اللہ ہے اور شفاعت قبول کرنے یا نہ کرنے کا فعل اُسی کا ہے۔ پھر وہ استدلال کرتے ہیں کہ ان آیات میں عاصیوں اور نافرمان لوگوں کی شفاعت کی قبولیت کی نفی ہے جو معتزلہ کا مسلک ہے۔[۱۸]

علوم بیان ومعانی کا استعمال

پروفیسر گنّوری امام زمخشری کی ایک تکنیک علوم معانی و بیان کے ذریعہ معتزلی افکار ونظریات کی تائید قرار دیتے ہیں۔ درج ذیل آیت میں رویت باری کا ذکر ہے۔ وہ اُسے حقیقی مفہوم سے مجازی مفہوم کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ ایک خاص حاسّہ کے ذریعہ ادراک کرنا معتزلہ کے تصور توحید وتنزیہ پر ضرب لگاتا ہے۔ اس مشکل کا حل نکالنے کے لیے زمخشری رویت کے معنی معرفت کے لیتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

وَلَمَّا جَآءَ مُوسَىٰ لِمِيقَٰتِنَا وَكَلَّمَهُۥ رَبُّهُۥ قَالَ رَبِّ أَرِنِيٓ أَنظُرْ إِلَيْكَ ۚ قَالَ لَن تَرَىٰنِي وَلَٰكِنِ ٱنظُرْ إِلَى ٱلْجَبَلِ فَإِنِ ٱسْتَقَرَّ مَكَانَهُۥ فَسَوْفَ تَرَىٰنِي ۚ فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُۥ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُۥ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ أَفَاقَ قَالَ سُبْحَٰنَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا۠ أَوَّلُ

الْمُؤْمِنِیْنَo(الأعراف:۱۴۳)

جب وہ (یعنی موسیٰ) ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر پہنچا اور اُس کے رب نے اُس سے کلام کیا، تو اُس نے التجا کی کہ ''اے رب، مجھے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں۔'' فرمایا ''تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا۔'' چنانچہ اُس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلی کی تو اُسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بولا: ''پاک ہے تیری ذات، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں ہوں۔''

امام زمخشری حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست أَرِنِیۤ أَنْظُرْ إِلَیْکَ کے معنی بتاتے ہیں (اے رب، مجھے اپنی معرفت عطا کردے جو بالکل واضح اور روشن ہو) أَرِنِی کہہ کر گویا آیاتِ الٰہی کی گہری اور واضح معرفت عطا کرنے کی درخواست ہے اور أَنْظُرْ إِلَیْکَ کا مطلب ہے کہ میں تیری ایسی معرفت حاصل کرسکوں جس کا حصول ناگزیر ہے۔ وہ مثال میں حدیث رسول کو پیش کرتے ہیں

سَتَرون ربّکم کما ترَون القمرَ لیلة البدر [۱۹]

اس حدیث کے معنی وہ بتاتے ہیں کہ تم اپنے رب کی روشن اور واضح معرفت حاصل کرلو گے گویا بچشم سر اُسے دیکھ لو گے اور انکار کی تاب نہ لاسکو گے جیسے چودھویں رات کا چاند اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اِس مجازی مفہوم کی روشنی میں رویت کے اثبات کا خطرہ ٹل جاتا ہے اور معتزلہ نظریہ کے مطابق تشبیہ وتجسیم کا لزوم بھی باطل ہو جاتا ہے۔

دوسری مثال پروفیسر گنوری نے درج ذیل آیت میں مجازی مفہوم کو ترجیح دینے کی پیش کی ہے تاکہ زمخشری کے اعتزالی موقف کی تائید کرسکیں۔ اس آیت میں بھی حقیقی مفہوم سے نظریۂ اعتزال پر زد پڑتی ہے:

وُجُوهٌ یَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ o إِلَی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ o(القیامہ:۲۲،۲۳)

اس روز کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ میں نظر کو اُس کے حقیقی معنی سے ہٹا کر اللہ کی نعمت کی توقع اور بھلائی کی امید کے مجازی معنی میں لیتے ہیں۔[۲۰]

یہ بحث مصری مصنف مصطفیٰ الصاوی الجوینی کے ہاں زیادہ تفصیل سے موجود ہے۔ ان دونوں مذکور مقاماتِ قرآن سے انھوں نے استدلال کیا ہے مگر سورہ القیامۃ کی آیات ۲۲-۲۳ میں معانی وبیان کے نکتوں کی آڑ میں اعتزالی فکر کی تصویب ذرا مفصل طریقے سے کی ہے جسے پروفیسر گنوری نے غالباً اختصار کی وجہ سے نظر انداز کر دیا ہے۔

امام زمخشری کہتے ہیں کہ سورۃ القیامۃ کی آیات میں اِلٰی رَبِّهَا کو مقدم کر کے حصر کا مفہوم نکالا ہے اور اختصاص کا امتیازی معنی مراد لیا ہے۔ روز حشر پوری کائنات کی خلقت جمع ہوگی۔ نفسانفسی کا عالم ہوگا مگر مومنین کے چہرے تر و تازہ ہوں گے کیوں کہ وہ ہر قسم کے غم وحزن سے محفوظ ہوں گے۔ اس حالت میں صرف خدا کو دیکھنے کا مفہوم محال اور غیر عقلی ہے۔ ناگزیر ہے کہ نظر کے معنی ایسے ہوں جس سے حصر اور اختصاص کا امتیاز درست معلوم ہو اور وہ معنی ہے: اللہ سے امید اور اُس کی رحمت کی توقع۔ صرف اللہ سے مومنین کو امید ہوگی کیوں کہ ایمان اور عمل صالح کا توشہ اُن کے ہم راہ ہوگا۔

اِلَی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ میں اِلیٰ ربّها کو مقدم کر کے حصر اور اختصاص کا جو امتیازی معنی زمخشری نے مراد لیا ہے اُس کے ثبوت میں آیاتِ قرآنی کو پیش کیا ہے۔

إِلَی رَبِّکَ یَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ٥(القیامہ:۱۲)

اُس روز تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہوگا۔

إِلَی رَبِّکَ یَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ٥(القیامہ:۳۰)

وہ دن ہوگا تیرے رب ہی کی طرف روانگی کا۔

أَلَا إِلَی اللَّهِ تَصِیْرُ الأُمُوْرُ٥(الشوریٰ:۵۳)

خبردار رہو، سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

وَإِلَی اللَّهِ المَصِیْرُ٥(النور:۴۲، فاطر:۱۸)

اور اُسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔

وَإِلَیهِ تُرجَعُوْنَ٥(البقرہ:۲۴۵)

اور اُسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔

عَلَیہِ تَوکَّلۡتُ وَ اِلَیۡہِ اُنِیۡبُ۝ (ہود:۸۸،الشوریٰ:۱۰)

اُسی پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملے میں اُسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔[۲۱]

تقدیم سے حصر اور اختصاص کے مفہوم کے حق میں امام زمخشری نے اتنی آیات کے حوالے دے دیئے مگر نظر کے مجازی معنی (امید اور توقع رکھنا) کے حق میں وہ ایک آیت بھی پیش نہ کر سکے۔ یہاں انھیں عقلِ محض اور استدلال ہی کا سہارا لینا پڑا۔

تمثیل کا اسلوب

قرآن مجید کی اعتزالی تفسیر میں تمثیل کے ادبی و بلاغی اسلوب کا استعمال بھی صاحب الکشّاف کی ایک خصوصیت ہے۔ پروفیسر گنّوری نے اس سیاق میں مصری مصنف مصطفیٰ الصاوی الجوینی سے اخذ بھی کیا ہے اور اُن پر اضافہ بھی۔

درج ذیل دو آیات کی معتزلی تفسیر کا پروفیسر گنّوری نے حوالہ دیا ہے:[۲۲]

وَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعۡیُنِنَا وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ حِیۡنَ تَقُوۡمُ۝ (الطّور:۴۸)

اے نبیؐ اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو، تم ہماری نگاہ میں ہو۔ تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو۔

اس آیت میں فَاِنَّکَ بِاَعۡیُنِنَا کا ظاہری مفہوم معتزلہ کے عقیدہ تجسیم وتشبیہ کے منافی ہے اس لیے امام زمخشری اسے تمثیل قرار دیتے ہیں اور آیت کے ٹکڑے ''تم ہماری نگاہ میں ہو'' کو ''ہم تمہاری حفاظت اور نگہداشت کر رہے ہیں'' کے معنی میں لیتے ہیں۔ دوسری آیت ہے:

کَلَّاۤ اِنَّھُمۡ عَنۡ رَّبِّھِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ۝ (المطففین:۱۵)

ہرگز نہیں، بالیقین اُس روز یہ اپنے رب کی دید سے محروم رکھے جائیں گے۔

اس آیت میں کافروں کا محجوب ہونا اُن کی اہانت کی تمثیل ہے ''وہ اللہ کی دید سے محروم رکھے

جائیں گے یعنی تمثیل کی زبان میں اُن کا مذاق اڑایا گیا ہے اور توہین کی گئی ہے۔ بادشاہوں کے دربار میں اذنِ باریابی اُنھی لوگوں کو ملتا ہے جو اُن کے نزدیک مقرب اور مکرم ہوں اور محروم دیداُنھی کو کیا جاتا ہے جو کم سواد اور بے وقعت ہوں۔ [۲۳]

تمثیل وتخیل کے ذریعہ اعتزالی تفسیر کی تکنیک کے باب میں مصطفیٰ الصاوی الجوینی نے ''لَفِّ بیانی'' اور ''مشاکلت'' کے دو ادبی اسالیب کا بھی ذکر کیا ہے جسے پروفیسر گنوری نے نظرانداز کر دیا ہے۔ لَفِّ بیانی کی مثال میں وہ درج ذیل آیت کو پیش کرتے ہیں:

لَّا تُـدْرِكُـهُ الْأَبْـصَـارُ وَهُـوَ يُـدْرِكُ الْأَبْـصَـارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ٥(الانعام:۱۰۳)

نگاہیں اُس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے۔ وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے۔

لفِّ بیانی کے اس اسلوب میں قرآن نے اضداد نظریات وتصورات کو خوبصورتی سے سمیٹ لیا ہے۔ علامہ زمخشری کہتے ہیں کہ اللہ کی صفت اللطیف بتائی ہے یعنی **یلطف عن أن تدرکه الابصار** (اتنا لطیف ہے کہ نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں) اور وہ الخبیر ہے یعنی **الخبیر بکلّ لطیف فهو یدرک الابصار لا تلطف عن ادراکه** (ہر لطیف اور باریک چیز سے باخبر ہے اِسی لیے وہ نگاہوں کا ادراک کر لیتا ہے اور نگاہیں اُس کے ادراک سے بچ نہیں سکتیں۔)

اسلوبِ مشاکلت سے بھی علامہ زمخشری نے معتزلہ افکار کی تائید کا کام لیا ہے۔ الصاّوی الجوینی درج ذیل آیت کو پیش کرتے ہیں۔ اس میں حقیقی معنی مراد نہیں لیے گئے ہیں۔ برسبیلِ لفظی مجانست الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور یہ کلام کی بلاغت ہے۔ قرآن کہتا ہے:

تَـعْـلَـمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَا أَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ٥(المائدہ:۱۱۶)

آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے۔ آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔

زمخشری کہتے ہیں کہ **لَا أعلَمُ مَا في نفسكَ** دراصل لفظی اور ظاہری مفہوم کے لیے

استعمال نہیں ہوا کہ تجسیم وتشبیہ لازم آئے بلکہ **تعلم مافی نفسی** لفظی مجانست اور مشاکلت کی خاطر آیا ہے اور یہ تمثیل کے وسیع تر اسلوب میں آتا ہے۔[۲۴]

قدرتِ قاہرہ کا استعارہ

اسلوبِ تمثیل کے بلاغی وادبی مباحث کے ذریعہ اعتزالی تفسیر کی تکنیک کے سیاق میں پروفیسر فضل الرحمٰن گنّوری نے بعض مفید مثالوں کا اضافہ کیا ہے جن سے تمثیل کے اسلوب کی نزاکتوں، لطائف اور اسرار کی نقاب کشائی ہوتی ہے اور معانی کی ایک دنیا آباد ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ درج ذیل آیت کی تفسیر میں زمخشری بحث کرتے ہیں کہ یہاں حقیقی معنی مراد ہے نہ مجازی۔ یہ اللہ کی قدرت قاہرہ کی بس ایک تمثیل ہے، اس میں زمین اور آسمان پر اللہ کے مکمل اقتدار اور تصرف کو بیان کرنے کے لیے استعارہ اور تمثیل کی زبان استعمال ہوئی ہے:

> وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ وَالْأَرْضُ جَمِيعاً قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّماوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ ٥
> (الزّمر:٦٧)
>
> اِن لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ کی جیسا کہ اُس کی قدر کرنے کا حق ہے۔ (اُس کی قدرتِ کاملہ کا حال تو یہ ہے کہ) قیامت کے روز پوری زمین اُس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اُس کے دستِ راست میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ پاک اور بالاتر ہے وہ اُس شرک سے جو یہ کرتے ہیں۔

زمخشری اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں:

> ''اس کلام کا مقصود یہ ہے کہ صورت حال کی بھرپور عکاسی ہوجائے۔ اللہ کی عظمت وقوت کی ایسی تصویر کشی ہوجائے کہ اس کے جلال وجبروت کی تہ تک آدمی پہنچ سکے۔ اس تصویر کشی میں مٹھی اور دستِ راست کے الفاظ نہ حقیقی معنی میں استعمال ہوئے ہیں نہ مجازی معنی میں۔ اِسی کی وضاحت اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضرت جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں:

یـا أبا القاسم إن اللّٰه یُمسک السَمٰواتِ والأرض یومَ القیامة علـی إصبعٍ والأرضین علـیٰ إصبعٍ والـجبـال علی إصبعٍ والشـجـر عـلـی إصبعٍ وسـائـر الخلق علی إصبعٍ ثم یهزهن فیقولُ أنا الملک.

اے ابوالقاسم! اللہ تعالیٰ قیامت کے روز آسمانوں اور اِس زمین کو ایک انگلی پر اٹھائے گا۔ بقیہ زمینوں کو ایک انگلی پر اٹھائے گا۔ پہاڑوں کو ایک اور انگلی پر اٹھائے گا۔ درختوں کو ایک انگلی پر اٹھائے گا۔ ساری مخلوقات کو ایک انگلی پر اٹھائے گا پھر اُن انگلیوں کو حرکت دیتے ہوئے کہے گا: میں ہوں بادشاہ!

حدیث کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبریلؑ کی باتوں کو سن کر تعجب سے ہنس پڑے۔ پھر اُن کی تصدیق کے لیے سورہ الزّمر کی آیت ۶۷ کی تلاوت فرمائی۔ [۲۵]

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد علامہ زمخشری تبصرہ کرتے ہیں:

''افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم کو حیرانی ہوئی اور صرف اس وجہ سے ہنسے کہ آپ نے حضرت جبریل علیہ السلام کی باتوں سے وہی مفہوم سمجھا جو علمائے معانی و بیان اِس طرح کے الفاظ سے سمجھتے ہیں۔ اس فہم میں انگلیوں میں اٹھانے اور انھیں حرکت دینے کا کوئی معنی شامل نہیں ہے۔ اس فہم کا اول و آخر خلاصہ یہ ہے کہ یہ الفاظ اللہ کی قدرتِ قاہرہ پر دلالت کرتے ہیں اور بس۔''

صحفِ سماویہ میں تمثیلات

علامہ زمخشری کی آگے کی بحث بڑی زوردار ہے۔ صحف سماویہ کو سمجھنے میں اِن تمثیلات کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ دقیق معانی اور لطیف تصورات کی تفہیم میں اِن تمثیلوں کا بڑا کردار ہے۔ یہ اقتباس بڑا اہم ہے:

''اعمالِ عزیمت کے فہم میں انسانی ذہن متحیر رہتا ہے۔ دماغ انھیں آسانی

سے گرفت میں نہیں لے پاتا۔ قلوب کے لیے انھیں اپنے اندر اتارنا آسان نہیں ہوتا اور انھیں سننے والا سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ اِلّا یہ کہ خیال آرائی اور تمثیل کے اس اسلوب کو استعمال کیا جائے۔ علم بیان میں اِس سے زیادہ دقیق، اِس سے زیادہ لطیف ورقیق باب کوئی دوسرا نہیں ہے۔ قرآن پاک میں، تمام آسمانی صحیفوں میں اور تمام انبیاء کے کلام میں متشابہات کی تاویل وتفہیم کے لیے اِس سے زیادہ کارگر اور مؤثر کوئی اسلوب نہیں ہے۔ اِن کا اکثر حصہ تخیل ہی پر مشتمل ہے جن کی تفہیم میں قدیم زمانے سے لغزشیں ہوتی آ رہی ہیں۔ ان مباحث میں پڑنے والے علماء کے حصہ میں بحث وتحقیق کا کم ہی حصہ آ سکا ہے ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ دقیق علوم کے جنگل میں ایک علم ایسا ہے جس کی کماحقہ، قدر انھوں نے کی ہوتی تو اُن پر یہ حقیقت مخفی نہ ہوتی کہ تمام علوم اِس عالمِ واحد کے محتاج اور اُس پر منحصر ہیں کیوں کہ اسی علم سے ہی اِن علوم کی تکلیف دہ گرہیں کھلتی ہیں اور انتہائی پیچیدہ گتھیاں سلجھتی ہیں۔

قرآن مجید کی کتنی ہی آیات ہیں اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی بڑی تعداد ہے جن کی بے جا تاویلات اور فاسد تفہیمات میں عمریں ضائع ہو گئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاویل کرنے والے علماء کو اِس علم کا کوئی شمّہ ہاتھ نہ آیا نہ انھیں اس کی کنہ تک ادنیٰ رسائی ہو سکی۔[۲۶]

مولانا امین احسن اصلاحیؒ صاحبِ تدبر قرآن نے بھی تمثیل کی قدر وقیمت پر نفیس بحث کی ہے۔ سورہ بقرہ آیت ۲۶ کی تفسیر میں اِس اسلوب کی اثر آفرینی پر اُن کی تحریر معرکہ آرا ہے۔ کسی معنوی حقیقت کی تفہیم اور اُس کی تصویر کشی میں تمثیلات نے بڑا مؤثر کردار کیا ہے:

''اعلیٰ حقائق اور روحانی لطائف کو جب تک تمثیل کا جامہ نہ پہنایا جائے اُس وقت تک وہ عام عقل کی گرفت میں نہیں آتے۔ اس وجہ سے روحانی حقائق کی تعلیم میں اِس صنفِ کلام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ انبیاء اور حکماء

کے کلام میں اس کی بڑی کثرت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ تورات اور انجیل پر
ایک نظر ڈالنے سے ہوسکتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا کلام تمثیلات سے
بھرا ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں بھی بے شمار تمثیلات ہیں۔
قرآن میں بھی اِس صنفِ کلام کی نہایت اعلیٰ مثالیں موجود ہیں۔''[۲۷]

مولانا اصلاحی نے ایک خوبصورت بحث تشبیہ اور تمثیل کے درمیان واضح فرق پر کی ہے۔ ایک عام تشبیہ میں اصلی نگاہ مشبّہ اور مشبّہ بہٖ پر ہوتی ہے اور ان دونوں کے اجزا کو الگ الگ ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کے دیکھا جاتا ہے کہ ان میں باہم دِگر کتنی مشابہت پائی جاتی ہے اور پھر اُسی مشابہت کے لحاظ سے اُس تشبیہ کا حسن وقبح متعین ہوتا ہے۔ اس کے برعکس تمثیل میں اجزا کی جگہ ایک صورت واقعہ کو دوسری صورتِ واقعہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اگر ایک صورت حال اور دوسری صورتِ حال میں پوری مطابقت موجود ہے تو وہ مکمل تمثیل ہے خواہ تشبیہ کے فنّی ضوابط اُس پر نہ منطبق ہو رہے ہوں۔[۲۸]

ضعیف احادیث سے استدال

معتزلی افکار وعقائد کے اثبات کے لیے الکشاف میں ضعیف احادیث سے استدلال کی تکنیک پر پروفیسر گنّوری نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ مصری عالم مصطفیٰ الصّاوی الجوینی ہی سے مستفاد اور اُن ہی کی تحریروں کا اختصار ہے۔ معتزلہ کے لیے زمخشری نے اہل العدل والتوحید کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اُن ہی کے علم کو اشرف ترین علم مانا ہے۔ وہ اس مفروضہ کے اثبات کے لیے آیت الکرسی کی تفسیر میں متروک وموضوع روایات بیان کرتے ہیں۔[۲۹] ان روایات کا تذکرہ مصری مصنف نے کیا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس گھر میں اِس آیت کی تلاوت کی جاتی ہے اُس سے شیطان تیس دنوں
کے لیے ہجرت کر جاتے ہیں اور چالیس راتوں تک اُس گھر میں جادوگر یا
ساحرہ داخل نہیں ہوسکتی۔ اے علی! اپنی اولاد اور اہلِ خانہ کو اس آیت کی
تعلیم دو اور اپنے پڑوسیوں کو یہ آیت سکھاؤ۔ اِس سے بڑی کوئی آیت نازل

نہیں ہوئی۔''

''حضرت علیؓ سے وایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے تمہارے بنی کو منبر سے اشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: جس نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پابندی سے پڑھی اسے جنت میں داخل ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ کوئی راست باز یا عبادت گزار شخص ہی اس کی پابندی کرسکتا ہے اور سوتے وقت جس نے یہ آیت پڑھ لی اُسے اللہ محفوظ و مامون بنادیا اور اُس کے پڑوسی کو بھی اور پڑوسی کے پڑوسیوں کو اور اُس کے اردگرد کے تمام گھروں کو بھی اللہ نے امان دے دی۔''[۳۰]

اِسی طرح کی بعض دیگر غیر ثقہ روایات کا تذکرہ بھی فاضل مصری عالم نے علامہ زمخشری کی الکشّاف کے حوالہ سے کیا ہے۔ آگے علامہ زمخشری فرماتے ہیں:

سورۃ الاخلاص کی فضیلت اسی لیے ہے کہ اس میں اللہ کی وحدانیت، اُس کی تعظیم وتمجید اور صفاتِ عظمیٰ کا مضمون بیان ہوا ہے اور اللہ رب العزت کے ذکر سے بڑا کوئی ذکر نہیں۔ اس لیے اُس کا ذکر کرنا تمام اذکار سے بڑا اور افضل ہے۔ اِسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے پاکیزہ اور بلندترین علم اہل العدل والتوحید کا علم ہے۔ اِس علم کے دشمنوں کی کثرتِ تعداد سے کبھی دھوکہ نہیں کھانا چاہیے:

إن العــرانيـن تـلـقـاهـا مُحسّــدةً

ولا تــرىٰ لــلــئــام الـنّـاسِ حسّـاداً

شریف الطبع انسان سے حسد کرنے والے تمہیں بہت مل جائیں گے۔

مگر کسی کمینہ خصلت سے حسد کرنے والا تمہیں کوئی نہ ملے گا۔[۳۱]

قواعدِ نحو کو تابع بنانا

قرآن مجید کی تفسیر میں معتزلی عقائد کے اثبات کے لیے علامہ زمخشری نے قواعدِ نحو کو جس

طرح اپنا تابع و خادم بنایا ہے اُس کی تفصیل مصطفیٰ الصاوی الجوینی نے فراہم کی ہے۔ یہ بحث بھی پروفیسر فضل الرحمٰن گنوری نے اپنی کتاب میں شامل کی ہے اور اُن کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ معتزلہ کے دو بنیادی عقائد وعد و وعید اور منزلہ بین منزلتین کو قرآن مجید کی آیات کے ظاہر معنی سے بچانے کے لیے علامہ زمخشری قواعد نحو میں بھی تصرف کرنے سے نہیں چوکتے۔ درج ذیل آیت کا مطالعہ دلچسپ ہے:

> إِنَّ اللّٰهَ لاَ يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ وَمَن يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرَى إِثْماً عَظِيماً ○(النسا:۴۸)
>
> اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا اُس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔

اس آیت سے معتزلہ کے موقف کی تردید ہوتی ہے۔ شرک سے کہتر درجہ کے گناہ کو اللہ بغیر توبہ کے بھی معاف کر دیتا ہے مگر شرک کرنے والا جب تک توبہ نہ کرے اُسے معاف نہیں کرتا۔ اس آیت کی زمخشری من مانی تاویل کرتے ہیں اور اس میں نحوی قواعد کا بھی خیال نہیں رکھتے کیونکہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو وہ المنزلۃ بین المنزلتین میں رکھتے ہیں:

" **لاَ يَغْفِرُ** اور **يَغْفِرُ** کے مثبت و منفی دونوں فعل **لِمَن يَشَآءُ** سے متعلق ہیں گویا یہ عبارت اس طرح ہے: **إِنَّ اللّٰهَ لاَ يَغْفِرُ لمن يشاء الشرك ويغفر لِمَن يَشَآءُ ما دون الشرك** یعنی، اللہ جس کے حق میں چاہتا ہے شرک کو معاف نہیں کرتا اور جس کے حق میں چاہتا ہے شرک سے کم تر درجہ گناہ کو معاف کر دیتا ہے۔ پہلے جملے میں مراد توبہ نہ کرنے والے مشرک ہیں اور دوسرے جملے میں تائب مشرک مخاطب ہیں۔ عربی زبان میں اس کی نظیر موجود ہے۔ کہا جاتا ہے:

إِنَّ الأمير لا يبذل الدينارُ ويبذلُ القنطار لِمن يشآء: (امیر ایک دینار بھی خرچ نہیں کرتا اور جس کو چاہتا ہے ڈھیروں سونا دے دیتا ہے، اس جملے کو کھول دیا جائے تو یہ مطلب نکلتا ہے:

إِنَّ الأمير لا يبذل الدينار لمن لا يستأهله، ويبذلُ القنطار لِمن يستأهله:

(جسے اہل نہیں سمجھتا اُسے امیر ایک دینار بھی نہیں دیتا۔ لیکن جس کو مستحق سمجھتا ہے اُس پر ڈھیروں سونا لٹا دیتا ہے)[۳۲]

رازقِ مطلق کی نفی

مصری عالم ایک اور آیت کو پیش کرتے ہیں جس سے انسانی آزادی کے مسئلہ میں اعتزالی موقف پر زد پڑتی ہے مگر علامہ زمخشری نحوی قواعد کا استعمال اپنے موافق کر کے معتزلہ کے عقیدہ کا اثبات کرتے ہیں۔ اللہ پابند ہے کہ وہ بندوں کی روزی کی تخلیق کرے مگر افعال کی تخلیق انسانوں کا فعل ہے۔ الصّاوی الجوینی کہتے ہیں کہ اس تعبیر میں زمخشری کا موقف ملفوف اور غیر صریح نظر آتا ہے۔[۳۳]

قرآن مجید کا اعلان ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَـرْزُقُـكُـم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ٥

(فاطر:۳)

لوگو! تم پر اللہ کے جو احسانات ہیں انھیں یاد رکھو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جو تمھیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟ کوئی معبود اُس کے سوا نہیں، آخر تم کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہو۔

علامہ زمخشری اس آیت میں خلق افعال عباد کو ثابت کرنے کے لیے **یَـرزُقُـکُم** کی تین نحوی تاویلات پیش کرتے ہیں:

۱۔ **یُرزُقکم** آیت میں خالق کی صفت بن جائے۔

۲۔ خالقٍ کے بعد **یَـرزُقـکُم** کو مضمر مان لیا جائے اور آگے کا ٹکڑا **یَـرزُقـکـم مـن السَّمـأء والأرض** اُس کی تفسیر تسلیم کر لی جائے۔

۳۔ آیت کے پہلے ٹکڑے **هَـلْ مِـنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ** کے بعد **یَرزُقکُم** کو جملہ مستأنفہ مان لیا جائے۔

اولین دونوں نحوی تاویلات میں اللہ کے رازق ہونے کی صفت زمین اور آسمان کے اندر

مقید ہو جاتی ہے۔ اللہ کے مطابق رازق ہونے کا تصور لازم نہیں آتا اور اس صورت میں افعال عباد کے لیے کافی گنجائش نکل آتی ہے اور معتزلہ کے نظریہ کا ابطال لازم نہیں آتا اور تیسری تاویل کے مطابق اللہ کے رازق ہونے کا عقیدہ واضح طور پر مِنَ السّمآء و الأرض کے ساتھ مقید ہے اور رازق مطلق ہونے کا نظریہ خود بخود آیت کے دائرہ سے خارج ہو گیا۔ اس طرح تینوں تاویلات کے مطابق علامہ زمخشری خلق افعال عباد کو صحیح تسلیم کر لیتے ہیں۔

نحوی قواعد کو اور اعراب کی زبردستی توجیہ کو عقیدۂ ارادہ وحریت فکر کے معتزلی اصول کی حمایت میں استعمال کرنے کی مثال بھی پروفیسر گنوری نے مصری مصنف سے مستعار لی ہے۔

حرّیتِ ارادہ کی جبری تائید

قرآن کا اعلان ہے:

وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ۝ فَضْلاً مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝(الحجرات:۷،۸)

خوب جان رکھو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمہاری بات مان لیا کرے تو تم خود ہی مشکلات میں مبتلا ہو جاؤ۔ مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لیے دل پسند بنا دیا۔ اور کفر وفسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل واحسان سے راست رَو ہیں اور اللہ علیم وحکیم ہے۔

اِن آیات میں فَضْلاً مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً مفعول ہے یا بغیر فعل مذکور کے مصدر ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ مفعول کیسے ہوگا جب کہ الراشدون میں فاعل صحابہ ہیں اور فضل ونعمت اللہ کا فعل ہے۔ فاعل کے متحد ہونے کی شرط یہاں پوری نہیں ہو رہی ہے؟ اس کے جواب میں علامہ زمخشری کی تفسیر دیکھیے:

''ایمان کی محبت دنیا اور کفر وفسق اور عصیان سے متنفر کرنا اللہ کی طرف

منسوب ہوا اور اس طرح تحسیب، تزیین اور تکریہہ (قرآنی اصطلاحات) کے نتیجے میں صحابہ کے اندر رشد اور راست روی پیدا ہوئی گویا یہ رشد بھی خدا کا فعل ہو گیا اس طرح راشدُون سے بھی منصوب ہونے کا جواز نکل آیا کیوں کہ فاعل دونوں کے گویا ایک ہو گئے البتہ فعل کی نسبت اللہ کی طرف ہے اور أُولَـئِکَ هُمُ الرَّاشِدُون جملہ معترضہ ہے یا فعل مقدر سے منصوب فَضْلاً مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً کو مان لیا جائے۔ اور فعل کے بغیر مصدر ہونے کی صورت یہ ہوگی کہ الـرَّاشِـدُون کو رُشداً مان لیا جائے کیوں کہ اُن کی راست روی اور راشدیت بھی اللہ کے فضل کا نتیجہ ہے۔ اس طرح نحوی طور پر دونوں میں موافقت اور سازگاری پیدا ہوگئی اور فَضْلاًوَنِعْمَة دراصل افضالاً اور انعاماً کے حکم میں داخل ہو گئے۔[۳۴]

اس طرح الـرَّاشِدُون کی جانب خلقِ افعال اور حریت ارادہ وفکر کی نسبت کا جواز نکل آیا اور علامہ زمخشری نے جبر واکراہ سے اور نحوی قواعد کی تاویل کر کے اعتزالی فکر کو بچالیا۔ انھوں نے حبَّبَ، زَیَّنَ اور کَرَّہَ کے افعالِ خداوندی کو لطف وتوفیق خداوندی کے معنی میں کنایہ کے طور پر لے لیا۔

حُسن نہیں، رفعتِ کردار

اس کے بعد کی جو عقلی بحث پروفیسر گنوری نے کشّاف کے حوالے سے چھیڑی ہے، وہ اُن کا اپنا مطالعہ وتحقیق ہے۔ یہ بحث مصری عالم الصّاوی الجوینی کے ہاں موجود نہیں ہے۔ علامہ زمخشری کہتے ہیں:

''ہر ذی ہوش اور صاحبِ عقل ودانش سے مخفی نہیں کہ کوئی آدمی قابلِ تعریف وتحسین اُسی وقت ہوتا ہے جب اُس نے کوئی فعل کیا ہو۔ آیت کا ظاہری مفہوم متقاضی ہے کہ الرّاشدون کی تعریف اللہ خود اپنے فعل کے سبب کرے جب کہ اللہ نے خود ایسے لوگوں کی تعریف کرنے سے منع کیا ہے۔ اس نے ایسے لوگوں کے خلاف اظہار نکیر کی ہے'':

لاَ تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ یَفۡرَحُونَ بِمَا أَتَواۡ وَّیُحِبُّونَ أَن یُحۡمَدُواۡ بِمَا لَمۡ یَفۡعَلُواۡ فَلاَ تَحۡسَبَنَّهُمۡ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الۡعَذَابِ وَلَهُمۡ عَذَابٌ أَلِیۡم ٥
(آلِ عمران:۱۸۸)

تم اُن لوگوں کو عذاب سے محفوظ نہ سمجھو جو اپنے کرتوتوں پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایسے کاموں کی تعریف انھیں حاصل ہو جو فی الواقع انھوں نے نہیں کیے ہیں۔ حقیقت میں اُن کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔

یہ عقلی توجیہ بھی قابلِ بحث تھی اِسی لیے علامہ زمخشری نے خود سوال اٹھایا۔ عرب حسن و جمال کی تعریف کرتے ہیں جب کہ یہ اللہ کا فعل اور اُسی کا عطیہ ہوتا ہے۔ اس کی تعریف و تحسین عوام میں قابلِ بحث نہیں بلکہ محمود و مقبول ہے؟ زمخشری نے خود اس کا جواب دیا کہ اہلِ عرب کے لیے یہ تعریف و تحسین اس لیے روا ہوگئی کہ انھوں نے حسین و جمیل شخص کا خوش گوار رویہ دیکھا اور اس کے اخلاق حسنہ اور رفعتِ کردار کا تجربہ کیا تو پکار اٹھے: اس شخص کے جسم پر جو چہرہ ہے وہ کتنا خوبصورت ہے۔ یہ تحسین خود اس کی ذات کی نہیں بلکہ اس کے اخلاق اور حسنِ معاشرت کی وجہ سے ہے یہ اُس کے کردار کی بلندی تھی جس نے اُسے حسین و جمیل بنایا ہے۔

آگے علامہ زمخشری اس تحسین و آفریں کی بھی اصلاح کرتے ہیں۔

تاہم ثقہ محققین اور علمائے معانی اس طرح کی تحسین کو درست نہیں مانتے وہ تعریف و توصیف کو خیر اور معروف کے بڑے اوصاف جیسے فصاحت، جواں مردی، مصنف مزاجی، پاکبازی اور اُن کے متعلقات کے اندر محدود قرار دیتے ہیں۔ وہ حسن و جمال کو، خوش حالی اور ثروت مندی کو ارکان خاندان و اولاد کی کثرت کو، جن میں انسان کے کسی عمل کا کوئی دخل نہیں ہوتا، عقل سے بعید اور فہم کے منافی تصور کرتے ہیں۔''[۳۵]

بلاغتِ قرآنی سے فیض یابی

پروفیسر فضل الرحمٰن گنوری کی ایک قابلِ قدر اور حیران کن بحث علامہ زمخشری کی بلاغتِ

قرآنی سے لطف اندوزی پر ہے۔قرآن مجید کا ساحرانہ ادب، اُس کے اعجازی اسالیب، اُس کے نظم وترتیب کی لطافتیں، زبان وبیان اور معانی کے ہوش ربا مقامات ولطائف تفسیر الکشّاف کا خاص موضوع ہیں۔اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ قرآنی ادب کی رعنائی ودل آویزی کا کوئی نکتہ چھوٹنے نہ پائے۔وہ قرآن مجید کی اِن آیات تک پہنچتے ہیں تو اُن پر ایک خاص کیفیت طاری ہوجاتی ہے:

> وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ o مَن جَاء بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّنْهَا وَهُم مِّن فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ آمِنُونَ o وَمَن جَاء بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ o (النمل:۸۸-۹۰)
>
> آج تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب جمے ہوئے ہیں، مگر اُس وقت یہ بادلوں کی طرح اُڑ رہے ہوں گے، یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہوگا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا ہے۔وہ خوب جانتا ہے کہ تم لوگ کیا کرتے ہو۔جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اُسے اُس سے زیادہ صلہ ملے گا اور ایسے لوگ اُس دن کے ہول سے محفوظ ہوں گے، اور جو برائی لیے ہوئے آئے گا، ایسے سب لوگ اوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے۔کیا تم لوگ اِس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو؟

علامہ زمخشری اِن آیات میں مخفی ادب وبلاغت، صنائع اور معانی وبیان کے اسرار پر دل کھول کر لکھتے ہیں جیسے اُن کا دل پسند موضوع ہاتھ آگیا ہو اور وہ اس کی لذت وفرحت سے مستفید ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتے۔وہ اِن آیات کی معنوی لطافتوں میں کھو جاتے ہیں اور بے ساختہ اُن کے قلم سے یہ جملے نکلتے ہیں:

> ''دیکھو یہ کلام کتنا بلیغ ہے۔اُس کا نظم اور اُس کی ترتیب کتنی عظیم الشان ہے۔اضمار ما فی الذکر کا اسلوب کس قدر موثر ہے۔تعبیر کتنی دل کش اور

خوبصورت ہے۔ آپس میں کتنا گہرا ربط ہے جیسے یہ سب ایک ہی سانس
میں لب کشا ہوں۔ آخر کوئی تو وجہ تھی کہ اس کلام نے صحت مند اور قوی کو
پچھاڑ دیا اور فصحائے عرب کو گونگا بنا دیا۔''

کفر و شرک کو محض مکّاری اور چال بازی قرار دینے اور اُسے بے وزن اور بے سند بتانے والی آیات کی تفسیر کرتے وقت علامہ زمخشری بے خود اور وارفتہ ہو جاتے ہیں اور قرآنی بلاغت کی معجز نمائی میں کھو جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

أَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلَى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَجَعَلُواْ لِلّهِ شُرَكَاء قُلْ سَمُّوهُمْ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لاَ يَعْلَمُ فِي الأَرْضِ أَم بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُواْ مَكْرُهُمْ وَصُدُّواْ عَنِ السَّبِيلِ وَمَن يُضْلِلِ اللّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ٥ (الرعد:۳۳)

پھر کیا وہ جو ایک ایک متنفس کی کمائی پر نظر رکھتا ہے (اُس کے مقابلے میں جسارتیں کی جا رہی ہیں کہ) لوگوں نے اُس کے کچھ شریک ٹھیرا رکھے ہیں؟ اے نبیؐ! ان سے کہو (اگر واقعی وہ خدا کے اپنے بنائے ہوئے شریک ہیں تو) ذرا اُن کے نام لو کہ وہ کون ہیں؟ کیا تم اللہ کو ایک نئی بات کی خبر دے رہے ہو جسے وہ اپنی زمین میں نہیں جانتا یا تم لوگ بس یوں ہی جو منہ میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے دعوتِ حق کو ماننے سے انکار کیا ہے اُن کے لیے اُن کی مکّاریاں خوش نما بنا دی گئی ہیں اور وہ راہِ راست سے روک دیے گئے ہیں، پھر جس کو اللہ گمراہی میں پھینک دے اُسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں ہے۔

اس آیت پر گفتگو کرتے ہوئے اُن کا قلم بے قابو ہو جاتا ہے اور وہ وجد کے عالم میں پکار اٹھتے ہیں:

''یہ استدلال اور اُس کے حق میں وارد حیران کن اسالیب خود چیخ چیخ کر
کہہ رہے ہیں اپنی فصیح و بلیغ زبان سے کہ یہ کسی انسان کا کلام ہرگز نہیں

ہوسکتا۔ یہ وہی سمجھ سکتا ہے جسے عرفان حاصل ہو اور جو خود انصافی کی جرأت سے مسلّح ہو۔'' [۳۶]

نتیجۂ بحث

پروفیسر فضل الرحمٰن گنّوری کی شاہ کار تصنیف ''زمخشری کی تفسیر الکشّاف- ایک تحلیلی جائزہ'' اور مصری عالم مصطفیٰ الصاوی الجوینی کی تحقیق انیق **منهج الزمخشری فی تفسیر القرآن وبیان اعجازه** کا تقابلی مطالعہ دلچسپ ہے اور عبرت آموز بھی۔ اس تقابلی مطالعہ سے راقم کو کافی علمی تحریک ملی۔ قرآن مجید کی بلاغت اور ادبی اعجاز کے نئے گوشے ہاتھ آئے۔ پروفیسر گنّوری کی کتاب کی مرکزی ''بحث معتزلی تفسیر کے منہج کا ایک مختصر تجزیہ'' بتاتا ہے کہ انھوں نے بنیادی طور سے مصری عالم کی تحقیق سے استفادہ کیا ہے۔ نظری نکات کے علاوہ الکشّاف سے قرآن کی مثالیں بھی وہی فراہم کی ہیں جو مصطفیٰ الصاوی الجوینی نے اپنی کتاب میں دی ہیں، لیکن کہیں مصری عالم کا حوالہ نہیں ہے۔ اس بھرپور استفادہ کے بعد یہ حوالے ناگزیر ہوگئے تھے۔ محض کتابیات میں سینکڑوں کتابوں کے درمیان اِس تحقیق کا تذکرہ علمی دیانت کے تقاضوں کی کماحقہ رعایت نہیں ہے۔

اس عظیم الشان کتاب میں طویل اقتباسات کی بھرمار ہے مگر اُن کا اردو ترجمہ نہیں دیا گیا ہے۔ پروفیسر گنّوری نے پیش لفظ میں توجیہ پیش کی ہے کہ بلاواسطہ عرب عبارت ہی درکار تھی کیوں کہ زبان وادب اسی کے متقاضی تھے یا غیر عربی داں حضرات کے لیے فہم مسئلہ کے نقطۂ نظر سے ترجمہ کچھ زیادہ مفید نہ ہوتا۔ [۳۷] یہ ناکافی توجیہ ہے۔ عربی داں حضرات کے لیے بھی عام طور پر زمخشری کی دقیق وفصیح عبارتوں کو سمجھنا آسان نہیں۔ بہتر تھا کہ تمام اقتباسات کے ترجمے بھی دیے جاتے تاکہ اردو داں طبقہ آسانی سے مستفید ہوتا۔

عقائد وافکار معتزلہ پر تقریباً سو صفحات مختص کیے گئے جو قاری کے لیے ذہنی وفکری تھکاوٹ کا سبب بن جاتے ہیں۔ مرکزی محور تفسیری ادب میں علوم بلاغت اور معانی وبیان کا مطالعہ تھا اِس اعتبار سے مطالعات میں علوم معانی وبلاغت کی تاریخ کا تعارف اور اس سیاق میں علامہ عبدالقاہر الجرجانی (متوفی ۱۰۷۸ء) کی علمی خدمات کا مطالعہ زیادہ بہتر تھا۔ حالاں کہ پروفیسر گنّوری نے تفسیری ادب کی

تاریخ پر سو صفحات کا تعارف پہلے سے شامل کر رکھا ہے مگر اس میں قرآنی بلاغت کا مطالعہ شامل نہیں ہے۔[۳۸]

پروفیسر گنّوری نے ۱۹۷۱ء میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ جمع کیا تھا۔ اشاعت ۱۹۸۲ء میں عمل میں آئی۔ شعبہ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وہ پی ایچ ڈی کے اسکالر تھے۔ اشاعت کے وقت اگر نظر ثانی کا موقع ملا ہوتا تو کتاب کی افادیت دو چند ہو جاتی۔ ان گزارشات کے باوجود یہ کتاب تفسیری ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے جسے علوم قرآن کا کوئی محقق نظر انداز نہیں کر سکتا۔

حواشی وتعلیقات

۱۔ چغانی، حبیب الرحمٰن، زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے، ایس ایچ پرنٹرز، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص: ۹۸

۲۔ فضل الرحمٰن (پروفیسر) زمخشری کی تفسیر الکشّاف — ایک تحلیلی جائزہ، دینیات فیکلٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۲ء، صفحات بڑی تقطیع پر ۵۸۰

۳۔ خان، سلیم احمد (ڈاکٹر) پروفیسر فضل الرحمن گنّوری — ایک باکمال شخصیت، مجلّہ دراساتِ دینیہ کی خصوصی اشاعت (سربراہان دینیات فیکلٹی نمبر) فیکلٹی آف تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۲۴ء، ص: ۹۷

۴۔ فضل الرحمٰن، کتاب الٰہی کے پانچ مطالبات، مشکوۃ پرنٹرس علی گڑھ، ۲۰۱۳، ص ۲۱

۵۔ دیکھیے تفصیل کے لیے راقم کی خودنوشت "سنگ گراں ہے زندگی"، مشکوۃ پرنٹرز اینڈ پبلشر، علی گڑھ، ۲۰۲۳ء، ص: ۱۰۹-۱۱۰

۶۔ اس مسئلہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ کتابیں بیک وقت دہلی، کویت اور لاہور سے شائع ہوئیں۔ انٹرنیشنل اسلامک فیڈریشن آف اسٹوڈنٹس آرگنائزیشنز (IIFSO) کویت نے ان کی مفت تقسیم کا انتظام کیا۔ انگریزی زبان میں بھی ان کے ترجمے شائع ہوئے۔ بعض تراجم شعبہ انگریزی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد سید امین اشرف مرحوم نے بھی کیے اور بعض مشکل مقامات میں راقم سے تعاون بھی لیا۔ وہ اس وقت بدر باغ میں مقیم تھے اور شمشاد مارکیٹ کی مسجد میں گاہے گاہے اُن سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ بڑے خوش گفتار، شیریں مزاج اور خلیق انسان تھے۔ ایک بار اُن کے مکان پر ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو کہنے لگے:

> ''فہد صاحب اگر کوئی تلوار لے کر میرے سر پر کھڑا ہو اور وہ دو منٹ کی مجھے مہلت دے دے تو خدا کی قسم میں اپنی باتوں سے اُسے قدموں میں جھکا لوں گا ورنہ میرا نام بدل

دیجیے گا۔''

ان کی بات کوئی لفاظی نہ تھی۔قائم چاند پوری نے کہا ہے:

موم کو سنگ کریں پل میں ہماری باتیں
لیکن افسوس یہی ہے کہ کہاں سنتے ہو

۷۔ دیکھیے راقم کی کتاب ''محبت فاتحِ عالم'' پبلی کیشنز ڈویژن،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۱۸ء باب دہم، وہ مردِ فقیر اولیٰ (سلطانِ درویش سے علمی روابط) ص:۲۴۵-۲۶۶

۸۔ حویٰ،سعید(پروفیسر)فی آفاق التعالیم ،اردوترجمہ:"اخوان المسلمون– مقصد، مراحل، طریقہ کار" مترجم:عبیداللہ فہد فلاحی، ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی،اشاعت دوم ۱۹۹۶ء،ص ۴۲-۴۳

۹۔ نفسِ مصدر،ص:۴۳،حاشیہ:۱

۱۰۔ مترجم کی گزارشات میں صراحت موجود ہے کہ اُس نے بعض مشکل مقامات کوحل کرنے میں برادرمکرم حافظ احسان الحق فلاحی، ذی وقار دوست مولانا اجمل ایوب اصلاحی (لیکچررشعبہ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) اور عزت مآب جناب فضل الرحمٰن گنوّری ڈین شعبہ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کافی مدد لی۔نفسِ مصدر،ص:۱

۱۱۔ ایوب،حسن، تبسیط العقائدالاسلامیة ،اردوترجمہ:"اسلام کی بنیادیں" ،مترجم:عبیداللہ فہد فلاحی، ہندوستان پبلی کیشنز دہلی،ستمبر۱۹۸۲ء،ص:۹

۱۲۔ نفس مصدر،ص:۵۱-۵۳

۱۳۔ دیکھیے وہی کتاب،اسلامک پبلی کیشنز پرائیوٹ لمٹیڈ لاہور،جنوری ۱۹۸۹ء،صفحات:۴۹۸

۱۴۔ اصلاحی،امین احسن،تدبر قرآن،فاران فاؤنڈیشن لاہور،جلد ششم،ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ/نومبر ۱۹۷۸ء،ص:۵۰۹

۱۵۔ فضل الرحمٰن(پروفیسر)زمخشری کی تفسیر الکشّاف– ایک تحلیلی جائزہ ،دینیات فیکلٹی،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،۱۹۸۲ء،ص:۲۹۲-۲۹۳

۱۶۔ الجوینی،مصطفیٰ الصّاوی، منہج الزمخشری فی تفسیر القرآن وبیان اعجازہٖ ،دارالمعارف مصر، القاہرہ،۱۹۵۹ء،ص:۱۴۰

۱۷۔ زمخشری کی تفسیر الکشّاف– ایک تحلیلی جائزہ،حوالہ بالا،ص:۲۹۳-۲۹۴

۱۸۔ منہج الزمخشری فی تفسیر القرآن وبیانِ اعجازہ،حوالہ،ص:۱۴۱

۱۹۔ البخاری،محمد بن اسماعیل- الجامع الصحیح ،کتاب مواقیت الصلوۃ، باب فضل صلوٰۃ العصر ، حدیث ۵۵۴، یہ حدیث حضرت جریرؓ سے مروی ہے۔وہ کہتے ہیں:''ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔آپ نے ایک رات کو چودھویں کا چاند دیکھا اور فرمایا:اِنّکم سترون ربکم کما ترون ھذا القمر لا تضامون فی رویتہٖ فإن استطعتم ان لا تغلبوا علی صلوٰۃ قبل طلوعِ الشمس وقبل غروبھا

فــافعـلـوا .(تم اپنے رب کواُسی طرح دیکھوگے جس طرح اس چاند کودیکھ رہے ہوکہ تمہیں اُسے دیکھنے میں کوئی دقت نہیں ہورہی ہے۔ اگر تمہارے لیے ممکن ہو کہ طلوع آفتاب سے پہلے کی نماز اور طلوع آفتاب کے بعد کی نماز کی ادائیگی پر قابو پاسکو تو ضرور کرو۔ پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: وَسَبِّــحْ بِــحَــمْــدِ رَبِّکَ قَبْـلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ. (سورہ قٓ:۳۹)

۲۰۔ زمخشری کی تفسیر الکشّاف– ایك تحلیلی جائزہ، حوالہ بالا، ص:۲۹۴-۲۹۵

۲۱۔ منهج الزمخشری فی تفسیر القرآن وبیان اِعجازہ، حوالہ بالا، ص:۱۴۲

۲۲۔ زمخشری کی تفسیر الکشّاف– ایك تحلیلی جائزہ، حوالہ بالا، ص:۲۹۸

۲۳۔ منهج الزمخشری فی تفسیر القرآن وبیان اِعجازہ، حوالہ بالا، ص:۱۴۵-۱۴۶

۲۴۔ نفس مصدر، ص:۱۴۶

۲۵۔ بخاری و مسلم میں یہ حدیث مختلف انداز میں بیان ہوئی ہے۔ اس میں حضرت جبریلؑ کی جگہ ایک یہودی عالم کا حوالہ ہے۔ پوری حدیث یوں ہے:

وعـن عبـدالـلّٰه بن مسعود قال: جاء حبر من اليهود إلى النبي صلى اللّٰه عليه وسلم فقال: يا محمد إن اللّٰه يمسک السماوات يوم القيامة على إصبع والأرضين على إصبع والجبال والشجر على إصبح والماء والثرى على إصبع وسائر الخلق على إصبع ثم يهز هن فيقول: انا الملک انا اللّٰه. فضحک رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم تعجبا مما قال الحبر تصديقا له. ثم قرأ: (وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهِ وَالْأَرْضُ جَمِيعاً قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّماوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِيْنِهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ. الزمر:٦٧) متفق عليه.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، ایک یہودی عالم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو اس نے کہا: محمد! روزِ قیامت اللہ آسمانوں کو ایک انگلی پر روک لے گا، زمینوں کو ایک انگلی پر، پہاڑوں اور درختوں کو ایک انگلی پر، پانی اور مٹی کو ایک انگلی پر، اور باقی ساری مخلوق کو ایک انگلی پر روک لے گا، پھر انھیں ہلائے گا اور فرمائے گا: میں بادشاہ ہوں، میں اللہ ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر تعجب کرتے ہوئے اور اس کی تصدیق کرتے ہوئے ہنس دیے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''انھوں نے اللہ کی قدر نہ کی جس طرح اس کی قدر کرنے کا حق تھا، اور روزِ قیامت تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے

ہوں گے، پاک ہے وہ ذات اور بلند ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں۔''
(الزمر:۶۷)متفق علیہ،رواہ البخاری ۴۸۱۱ ومسلم ۱۹/ ۲۷۸۶

۲۶۔ زمخشری کی تفسیر الکشّاف — ایک تحلیلی جائزہ، حوالہ بالا،ص:۲۹۶-۲۹۷۔اس طویل اقتباس کا ترجمہ راقم کا ہے۔ پروفیسر فضل الرحمٰن گنوری نے اکثر طول طویل اقتباسات نقل کیے ہیں اور اُن کا ترجمہ کرنے سے گریز کیا ہے جس سے اردو داں طبقہ کے لیے استفادہ بہت مشکل ہوگیا ہے۔ زمخشری کی زبان بڑی فصیح مگر مشکل ہے۔ اُسے عام عربی داں بھی نہیں سمجھ سکتے۔ بلاغت اور علوم معانی کے مباحث تو اور زیادہ دقیق اور پیچیدہ ہیں۔ضروری تھا کہ اِن کا ترجمہ کیا جاتا خواہ کتاب کی ضخامت بڑھ جاتی۔

۲۷۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، جلد اول، اگست ۱۹۷۶ء، ص:۹۷

۲۸۔ نفس مصدر، ص:۸۵-۸۶ یہ گفتگو فاضل مفسر نے سورہ بقرہ آیت ۱۷-۲۰ کی تفسیر میں دو تمثیلوں کی وضاحت میں کی ہے۔ یہ دونوں تمثیلیں یہود کے دو گروہوں سے متعلق ہیں۔ پہلی دو آیات میں یہود کے اُس گروہ کا ذکر ہوا ہے جن کے دلوں اور کانوں پر مہر لگ چکی تھی اور ایمان لانے والے نہ تھے۔ جب کہ آیات ۱۹-۲۰ میں اُن یہودیوں کی مثال بیان ہوئی ہے جنھوں نے نبی آخرالزماں کی آمد پر شتر مرغ کی پالیسی اپنائی اور آخری رسول پر ایمان نہ لائے، نتیجہ فکر دونوں گروہوں کا ایک نکلا، ضد اور ہٹ دھرمی اور آخری نبی کا انکار۔ دیکھیے نفس مصدر، ص:۸۶-۸۸

۲۹۔ زمخشری کی تفسیر الکشّاف — ایک تحلیلی جائزہ،حوالہ بالا،ص:۳۰۱-۳۰۲

۳۰۔ قرآن کریم کی سورتوں کے فضائل میں وارد اکثر روایات کی استنادی حیثیت مجروح ہے۔تفصیل کے لیے دیکھیے: السیوطی، جلال الدین، الإتقان فی علوم القرآن، مطبعۃ حجازی، قاہرہ، ۱۳۶۸ھ، جلد دوم، ص:۱۵۵-۱۵۶

۳۱۔ منہج الزمخشری فی تفسیر القرآن وبیان إعجازہ ،حوالہ بالا، ص:۱۴۸-۱۴۹۔فاضل مصنف نے تفصیل سے علامہ زمخشری کے منہج پر روشنی ڈالی ہے۔ زمخشری نے کسی حدیث سے اعتزالی فکر کے تصادم کی صورت میں یا تو اُسے مشکوک بنا دیا ہے یا اُس کی صحت کو تسلیم کر کے تاویل کر دی ہے اور قرآن مجید سے استدلال کر لیا ہے جیسے حدیث بیان کی جاتی ہے ''جب کسی بچے کی ولادت ہوتی ہے تو شیطان اُسے چھو لیتا ہے اور شیطان کے چھونے سے نومولود کی چیخیں نکل جاتی ہیں سوائے مریم اور اُن کے بیٹے کے (کہ اُن کے ساتھ یہ عمل نہیں ہوا)''
اس روایت کو نقل کر کے زمخشری کہتے ہیں:

فاللّٰهُ أعلم بصحتہ فَإِنْ صحَّ فَمعناه انّ کلّ مولود یطمع الشیطان في إغوائہ الّا مریمَ وابنَہا فإنّھما کانا معصومین وکذالک کلّ من کان فی صفتھما.

اللہ ہی کے علم میں ہے کہ یہ حدیث کتنی صحیح ہے اور اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اُس کی تاویل یہ ہوگی کہ ہر فرد کو شیطان بہکا دیتا ہے سوائے حضرت مریم اور اُن کے بیٹے کے، کیوں کہ وہ معصوم تھے۔ اِسی طرح ان تمام لوگوں کی

یہی کیفیت ہے جو اس صفت سے متصف ہوں۔
اس کے بعد زمخشری قرآن کی آیت سے استدلال کرتے ہیں:

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ○ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ○ (صٓ:۸۲-۸۳)

اُس نے کہا: ''تیری عزت کی قسم، میں اِن سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا۔ بجز تیرے اُن بندوں کے جنھیں تو نے خالص کر لیا ہے۔

زمخشری کہتے ہیں کہ نومولود کا شیطان کے چھونے سے چیخنا ایک تخیلاتی اور تمثیلی معاملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان اُسے بہکانے کی منصوبہ بندی کرتا ہے اور یہ سب تمثیل کی صنف سے ہے۔ ورنہ اللہ کی قدرت کاملہ اور اس کے فعّال (ہود:۱۰۷) ہونے کے منافی ہوگا۔ نفس مصدر، ص:۱۴۹-۱۵۰

۳۲۔ نفس مصدر، ص:۱۴۷

۳۳۔ نفس مصدر، ص:۱۴۷ **(و تعبیره هنا ملتوٍ ملفوف غیر صریح)**

۳۴۔ نفس مصدر، ص:۱۴۸

۳۵۔ زمخشری کی تفسیر الکشّاف-ایک تحلیلی جائزہ، حوالہ بالا، ص:۲۹۹-۳۰۰

۳۶۔ نفس مصدر، ص:۳۹۴-۳۹۵ پروفیسر فضل الرحمٰن گنوری نے اس مقام پر تفسیر الکشاف سے دیگر اقتباسات بھی نقل کیے ہیں جن سے فاضل مفسر قرآن کی بلاغت قرآنی سے لطف اندوزی کے شواہد ملتے ہیں اور بعض اقتباسات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ''اپنی ادبی عظمت، انفرادی شان نیز بلاغت قرآنی کے علم کے میدان کے تنہا شہ سوار ہونے کی حیثیت کا پورا احساس'' تھا۔ سورہ الزّمر آیت ٦٧ کی تفسیر کے بعد علامہ زمخشری نے اپنے حسن احساسات کو قلم بند کیا ہے، انھیں پروفیسر گنوری نے نقل کر دیا ہے۔ دیکھیے، نفس مصدر، ص:۳۹٦

۳۷۔ نفس مصدر، پیش لفظ، ص:ط

۳۸۔ مقدمہ میں فاضل مصنف نے تفسیری رجحانات کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ تفسیر بالرائے، لغوی رجحان، قصصی رجحان، فقہی رجحان، باطنی رجحان، صوفیانہ یا اشاری رجحان، فلسفیانہ رجحان، کلامی رجحان اور اس کے تحت شیعہ، زیدیہ، خوارج اور معتزلہ مکتبِ فکر پر سرسری گفتگو ہے۔ لغوی رجحان تفسیر میں ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ (۷۲۸-۸۲۵) یحییٰ بن زیاد الفرّا (تقریباً ۷٦۱-۸۲۲) ابواسحاق الزّجاج (متوفی ۹۲۳ء) جیسے ائمہ ادب و لغت کا خصوصی تذکرہ ہے مگر عبدالقاہر الجرجانی اس تذکرہ سے محروم ہیں۔ نفس مصدر، ص:۷۷-۸۰

ڈاکٹر محمد ایوب ندوی *

سمندروں میں عربوں کی تجارتی سرگرمیاں

عرب اصل میں جزیرہ نما عرب کے باشندے ہیں۔ یہ ایک جغرافیائی خطہ ہے جو جنوب مغربی ایشیا میں افریقہ ایشیا کے سنگم پر واقع ہے اور دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما ہے۔ یہ مغرب میں بحر احمر، شمال مشرق میں خلیج فارس (خلیج عرب) اور جنوب مشرق میں بحر ہند سے گھرا ہوا ہے۔ آج جزیرہ نما عرب میں سعودی عرب، عمان، یمن، کویت، قطر، بحرین اور متحدہ عرب امارات ممالک شامل ہیں۔ اس میں اردن اور عراق کے کچھ حصے بھی شامل ہیں۔ ''جزیرہ عرب'' کا لفظ حدیث کے مصادر میں بھی استعمال ہوا ہے، جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروکاروں سے یہود اور عیسائیوں کو جزیرہ نما عرب سے نکالنے کے لیے کہا تھا۔[1]

چونکہ صحرا جزیرہ نما کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے، اس لیے اس خطے میں پانی، فصلوں اور گنجان آبادی کی کمی ہے۔ عرب اسی لیے مہمانوں کے استقبال کے لیے عربی لفظ ''أهـلا و سهلا'' کہتے ہیں کیونکہ ''أهــل'' کا مطلب ہے مانوس لوگ، اور سہل کا مطلب زرخیز زمین ہے یعنی وہ جگہ جہاں امن اور خوراک دستیاب ہو۔ بارش زیادہ تر جنوب مغربی حصے میں ہوتی ہے، جہاں پہاڑی سلسلے ہیں۔ جزیرہ

* پروفیسر شعبہ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵ ای میل: ayubnadwi@gmail.com

نما عرب کی زیادہ تر آبادی تجارت اور کاروبار میں مصروف رہتی تھی کیونکہ بارشوں کی کمی کے باعث زراعت کا فقدان تھا۔

عرب تاجر گرمیوں میں زمینی اور بحیرہ روم کے راستے شام اور دیگر شمال مغربی حصوں کی طرف تجارت کے لیے سفر کرتے تھے اور سردیوں میں بحر ہند کے راستے مشرق میں سندھ، ہندوستان، سیلون (سری لنکا)، سیام (تھائی لینڈ) اور چین جاتے تھے۔ اس طرح سے جزیرہ نما عرب ہزاروں سال سے خطے میں ایک زمینی رابطے کی حیثیت رکھتا تھا اور ثقافتی ترقی کا مرکز بھی تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سوداگروں کا وہ قافلہ جو یوسف علیہ السلام کو مصر لے گیا وہ درحقیقت عرب تاجر تھے اس لیے اس کے مرکزی محل وقوع، یعنی جنوب مغرب میں مصر اور افریقہ، مشرق میں جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کو مختلف قوموں کی ثقافتی و تجارتی صدر مقام کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اسے تاریخ میں ایک اہم کردار حاصل ہے۔

یہ بات مشہور ہے کہ انسانی تہذیبیں بنیادی طور پر دریاؤں اور سمندری ساحلوں کے کناروں پر آباد ہوئیں۔ سب سے نمایاں مثالوں میں قدیم مصر ہے جو دریائے نیل کے قریب آباد ہوئے، دجلہ اور فرات کے زرخیز علاقے میں میسوپوٹیمیا کے لوگ، دریائے زرد پر قدیم چینی اور دریائے سندھ پر قدیم ہندوستانی شامل ہیں۔ اس کی وجہ پینے کے پانی کی مسلسل فراہمی اور فصلوں کو سیراب کرنے کی سہولیات تھیں۔ مزید یہ کہ لوگوں کا سفر اور سامان کا آسانی سے پہنچانا ممکن تھا۔ اس لیے جب نوح علیہ السلام نے سمندر سے دور کشتی بنانے کا عمل شروع کیا تو لوگوں نے ان کا مذاق اڑایا۔ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کے آغاز میں بھی لوگ کشتیوں اور بحری جہازوں سے واقف تھے۔

اب ہم اس حقیقت کی طرف آتے ہیں کہ عرب ساحلی تجارت میں کیوں اور کیسے شامل ہوئے؟ اور وہ کب سے اس تجارت سے وابستہ ہیں؟ ساحلی تجارت میں ان کی ابتدائی شمولیت کا تاریخی ثبوت کیا ہے؟ یہ کچھ سوالات ہیں جن کو ہم ذیل میں زیر بحث لائیں گے۔

ہم پہلے ہی بحث کر چکے ہیں کہ زرخیز زمین کی کمی نے عربوں کو اشیا درآمد اور برآمد کرنے پر مجبور کیا۔ ہم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ عرب مختلف اشیاء کی خرید و فروخت کے لیے مغرب اور مشرق کا سفر کرتے تھے۔ مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ ایک مقدس جگہ تھی جہاں تمام عرب قبائل کثرت سے جاتے تھے اور

حجاز میں بہت سے مشہور بازار تھے۔ یہ بازار نہ صرف تجارتی سامان کی دکانیں تھیں بلکہ وہاں کئی ثقافتی تقریبات بھی منعقد ہوتی تھیں۔ سوق عکاظ زمانہ جاہلیت میں ثقافتی پروگرام خصوصاً شاعری کے لیے مشہور تھا۔ منتخب اشعار خانہ کعبہ کی دیواروں پر لٹکائے جاتے تھے جن میں معلقات بھی شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ قریش میں ان سب کا ذکر اپنی طرف سے ایک فضل اور ایک نعمت کے طور پر کیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

> لِإِيْلَافِ قُرَيْشٍ o إِيْلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ o فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ o الَّذِیْ أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ o
>
> (ترجمہ): قریش کو مانوس کرنے کی وجہ سے، انھیں سردی اور گرمی دونوں کے سفر سے مانوس کرنے کی وجہ سے، تو انھیں اِس گھر کے رب کی عبادت کرنی چاہیے، جس نے انھیں بھوک میں کھانا دیا اور انھیں خوف سے امن بخشا۔ (سورہ قریش، آیت: ۴-۱)

عرب قدیم زمانے سے ساحلی تجارت سے وابستہ رہے ہیں۔ اسلام کی آمد سے بہت پہلے عرب سمندری راستوں پر سفر کرتے تھے۔ اسلام کے آنے کے بعد ان سفروں میں اضافہ ہوا۔ عربی ادب کا مطالعہ ہمیں ان سفروں کو جاننے میں مدد دیتا ہے جن میں عرب لوگ مصروف رہتے تھے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''تین مصادر کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن میں عربوں کے سمندر میں سفر کرنے اور زمانہ جاہلیت میں جہاز سازی میں مصروف رہنے کے بارے میں بتایا گیا ہے، وہ مصادر عربی زبان، عربی شاعری اور قرآن کریم کا ذخیرہ ہیں۔ ان ذرائع سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب ملاح اور بحری مسافر تھے۔''[۲]

عربی زبان میں جہاز رانی، بحری جہاز اور کشتیوں سے متعلق بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ کچھ الفاظ دوسری زبانوں سے لیے گئے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عرب دوسرے ممالک سے بھی رابطے میں تھے اور اگر ہم عربی زبان یعنی جزیرہ نما عرب کی زبان کا مطالعہ کریں تو ہمیں بہت سے ایسے

الفاظ ملتے ہیں جن کا براہ راست تعلق سمندر سے ہے۔مثال کے طور پر عربوں نے اپنی زبان میں دریا اور سمندر دونوں کو بیان کرنے کے لیے''بحر'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا: ''فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقاً فِيْ الْبَحْرِ يَبَساً''(سورہ طہ:۷۷)اسی طرح ہم لفظ یمّ کا استعمال اسی معنی میں پاتے ہیں جیسا کہ سورہ طہٰ میں موسیٰؑ کے قصے میں ہے: ''أَنِ اقْذِفِيْهِ فِيْ التَّابُوتِ فَاقْذِفِيْهِ فِيْ الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ''(آیت ۳۹)''اسے تابوت میں ڈالو،اسے دریا میں پھینک دو،سمندر اسے کنارے پر پھینک دے گا۔

عربی زبان میں جہاز کے معنی کے لیے دو الفاظ ہیں اور وہ ہیں ''سفینۃ'' اور''فلک'' اور یہ دونوں الفاظ قرآن پاک میں استعمال ہوئے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ فرمایا:أَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِيْنَ يَعْمَلُونَ فِيْ الْبَحْرِ (سورۃ الکہف:۷۹)جہاں تک کشتی کا تعلق ہے،وہ سمندر میں کام کرنے والے غریب مساکین کی تھی''اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:''وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا'' (سورہ ہود:۳۷)''اور ہماری آنکھوں کے سامنے اور وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔'' قرآن کریم نے ایک بڑے جہاز کے لیے لفظ جارية وجوار کا استعمال کیا ہے۔سورۃ الرحمٰن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:''وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنشَآتُ فِيْ الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ''ترجمہ:''اور جہاز بھی اسی کے ہیں جو دریا میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے ہوتے ہیں۔''(سورہ رحمٰن آیت:۲۴)یہ معلوم بات ہے کہ قرآن کریم کو عربی زبان اور اس کے علوم کا سب سے مستند ماخذ سمجھا جاتا ہے۔قرآن مجید میں مختلف حالات کے بارے میں،جن کا ملاحوں کو سمندر میں سامنا کرنا پڑتا ہے،تفصیل سے ذکر ہے۔ان مختلف حالات کو بیان کرنے والی آیات عربوں پر نازل ہوئیں،جن کا واسطہ قرآن سے سب سے پہلے پڑا اور چونکہ وہ ان حالات سے پہلے ہی واقف تھے،اس لیے ہم ان کو قرآنی آیات کے معانی سے پوری طرح آگاہ پاتے ہیں اور وہ ان خوبصورت جملوں کی فصاحت وبلاغت کو سراہتے ہیں اور ان کی تعریف بھی کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے:

''مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ o بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ o فَبِأَيِّ آلَاء
رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ o يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ o فَبِأَيِّ آلَاء
رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ o وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنشَآتُ فِيْ الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ

oفَبِأَيِّ آلَاء رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ [۳](سورہ الرحمٰن،آیت ۱۹-۲۴)
''اس نے دو سمندروں کو ملایا کہ بظاہر آپس میں ملتے ہیں، ان کے درمیان ایک رکاوٹ کہ وہ تجاوز نہیں کرتے، تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے، ان میں سے موتی اور مرجان نکلتے ہیں، تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟''

اور ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِيْ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّى إِذَا كُنتُمْ فِيْ الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُواْ بِهَا جَاءتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَجَاءهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّواْ أَنَّهُمْ أُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُاْ اللّهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَـذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِيْنَo [۴](سورہ یونس، آیت:۲۲)

''وہی ہے جو خشکی اور سمندر میں تمہیں چلاتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو، اور وہ موافق ہوا کے ساتھ ان کو لے کر چل رہی ہوتی ہیں، اور وہ اس پر خوش ہوتے ہیں، اچانک ایک طوفانی آندھی آتی ہے۔ اور ہر جگہ سے لہریں ان کے پاس آتے ہیں، اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ گھرے ہوئے ہیں۔ تو اللہ سے دین کو خالص کر کے دعا کرتے ہیں، اگر تو نے ہمیں اس سے بچالیا تو ہم شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے۔

قرآن کریم کی درج ذیل آیات میں ہمیں ایک خوبصورت بیان کی تصویر ملتی ہے جس میں سمندر کی حالت اور ملاحوں کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے، جسے سمندر کے معاملات کا علم رکھنے والے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُوراً فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ o [۵](سورہ

النور،آیت:۴۰)

(جیسے گہرے سمندر میں تاریک لہروں سے ڈھکا ہوا ہے، جس کے اوپر موجیں ہیں، جن کے اوپر بادل ہیں، اللہ نے جس کے لیے روشنی نہیں رکھی، اس لیے اس کے پاس روشنی نہیں ہے)

زمانہ جاہلیت میں عرب شاعروں نے سمندری اور ساحلی زندگی سے متعلق بہت سے الفاظ کا ذکر کیا۔ ایک جاہلی شاعر طرفۃ بن العبد کہتا ہے:

كأن حدوج المالكية غدوة

خلايا سفين بالنواصف من دد

عدولية أو من سفين ابن يامن

يجور بها الملاح طورا ويهتدي [6]

یہاں شاعر نے وادی دد کے علاقوں میں صبح کے وقت اونٹوں کے مشابہ بڑے بڑے بحری جہازوں کا ذکر کرتے ہوئے جو ابن یامن کے بڑے بڑے اونٹ کی طرح تھے اپنے محبوب کی رخصتی کی تصویر کشی کی ہے کہ کس طرح جہاز کا کپتان کبھی سمندر میں گم ہو جاتا ہے اور کبھی راستہ تلاش کر لیتا ہے۔

عرب کا ایک اور مشہور شاعر اعشی المیمون نے اپنے مالک کی تعریف کی ہے جو اس ہنگامہ خیز سمندر کی طرح دولت سے اس کو نوازتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

يكهب الخلية ذات الفلاح

قد كاد جؤ جوها ينحطم

تكأكأ ملاحها وسطها

من الخوف كوثلها يلتزم [7]

جس طرح سمندر میں بادبانوں کے ساتھ چلنے والے بڑے بڑے بحری جہازوں کے جھنڈوں کو بڑے پہاڑوں سے تشبیہ دی گئی ہے، اسی طرح بڑے بڑے اور اونچے بحری جہاز کو قلع کا نام دیا گیا ہے۔

عراق کے ایک اور شاعر عمرو بن کلثوم کہتے ہیں:

ملأنا البر حتى ضاق عنا

وموج البحر نملؤه سفينا

ہم نے زمین کو بھر دیا یہاں تک کہ وہ ہمارے لیے بہت تنگ ہوگئی اور سمندر کی لہروں کو ہم نے جہازوں اور کشتیوں سے بھر دیا۔

عربی ادب کے مآخذ میں سمندری اور ساحلی امور سے متعلق چیزوں کا وسیع استعمال اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ عرب ساحلی تجارت سے بخوبی واقف تھے اور وہ ان لوگوں میں سے تھے جو سمندری ساحلوں اور سمندروں کے پار سفر کرنے سے نہیں ڈرتے تھے۔

مختلف ذرائع سے ملنے والے تاریخی شواہد سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جزیرہ نما عرب کے لوگوں کے بحر ہند یا اس کے آس پاس واقع ممالک کے ساتھ طویل اور گہرے تعلقات تھے۔ ان تعلقات میں عربوں اور ہندوستانیوں کے تجارتی تعلقات بھی شامل تھے۔ ہندوستانی مسالے، عطر اور کپڑے تاریخ کے آغاز سے عربوں میں مشہور رہے ہیں۔ ہندوستانی فولاد سے بنی تلواروں کی تفصیل جاہلی شاعری میں بہت بیان کی گئی تھی۔ ہندوستانی الفاظ جیسے کافور، ادرک اور قرآن پاک میں استعمال ہونے والے بہت سے دوسرے الفاظ ہندوستانیوں اور عربوں کے درمیان بہت گہرے تعلق کا واضح ثبوت ہیں۔ یہ تجارت زیادہ تر ساحلی تجارت تھی۔

غالب امکان ہے کہ جزیرہ نما عرب کے عرب قدیم ترین لوگ تھے جو ساحلی تجارت کے ذریعے ہندوستانیوں سے مسلسل رابطے میں رہتے تھے اور انھوں نے ہندوستان کے مغربی اور جنوبی ساحلوں پر بار بار سفر کیا۔ موسمی ہواؤں کی وجہ سے ان کی ساحلی تجارت کو فروغ ملا، جس کی وجہ سے ان کی چھوٹی کشتیوں اور بحری جہازوں میں سال میں کم از کم دو سفر کرنے میں مدد ملی۔ دونوں خطوں کے ساحلوں کو دھونے والے بحیرہ عرب نے ان تعلقات کو فروغ دینے میں بڑا اور اہم کردار ادا کیا اور ''ہندوستانی سامان یمن، پھر شام، اور وہاں سے آخر کار مصر اور یہاں تک کہ یورپ کی منڈیوں تک پہنچایا جاتا تھا۔'' [۸]

حجاز میں اسلام کے ظہور نے نہ صرف عربوں کا ہندوستان اور ہندوستانیوں سے رابطہ مضبوط کیا بلکہ اسلام نے ان تعلقات کو ایک نئی جہت دی۔ عربوں کے دین اسلام اختیار کرنے کے بعد تجارت جاری رہی اور عرب تاجر اس دین کو تقریباً فوراً ہی ہندوستان کے مالابار علاقے میں لے آئے اور عرب کالونیاں اسلامی بستیاں بن گئیں اور یہ بستیاں مرکزی بندرگاہوں جیسے کھمبایت، چول اور ہوناور میں

پائی جاتی تھیں۔خلیج بنگال کے ساتھ دوسری بستیوں میں مسلمانوں کی موجودگی آٹھویں صدی عیسوی سے ملتی ہے۔سب سے بڑی عرب ساحلی بستیاں مالابار میں تھیں جہاں آج مسلمان آبادی کا ایک بڑا حصہ ہیں۔

اس کے علاوہ، مکہ مکرمہ نے جزیرہ نما عرب میں تجارت کے ایک مرکز کے طور پر کام کیا۔مکہ کی زیارت محض ایک عبادت نہیں تھی بلکہ مکہ افکار وخیالات اور سامان کے تبادلے کے لیے ایک جگہ بن گیا تھا۔عرب مسلمان تاجر جو مکہ مکرمہ سے اپنے سفر کے دوران افریقی عرب اور عرب ایشیائی تجارتی راستوں پر نکلتے تھے ان کا اثر بہت بڑا اور زبردست تھا۔اس طرح عرب اسلامی تہذیب کو تجارتی نیٹ ورک کے ساتھ ساتھ اس وقت کی نامعلوم سمندری دنیا میں ترقی اور توسیع نصیب ہوئی۔

مشہور ہے کہ ہندوستان میں اسلام کے آنے سے پہلے سنسکرت کے بہت سے الفاظ تجارت کے ذریعے عربی زبان میں داخل ہوئے تھے۔ہندوستانی سامان جزیرہ نما عرب کے پار افریقہ اور یورپ کو برآمد کیا جاتا تھا۔

سید سلیمان ندوی (۱۹۵۳-۱۸۸۴ء) کے مطابق قرآن کریم میں تین الفاظ مذکور ہیں اور ان سب کا تعلق ان مبارک نعمتوں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کو عطا کی ہیں۔وہ درج ذیل ہیں:
ادرک،قرآن پاک میں استعمال ہونے والا لفظ ہے،اس کی ابتدا سنسکرت زنجبیر سے ہوئی ہے۔اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:''وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا''[9] (سورۃ الانسان، آیت:۱۷)

قرآن میں پایا جانے والا ایک اور سنسکرت لفظ کافور ہے۔قرآن کہتا ہے: ''إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِن كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا''[10] (سورۃ الانسان،آیت:۵) ''بے شک نیک لوگ ایک پیالے سے پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوتی ہے۔'' جہاں تک قرآن کریم میں مذکور تیسرے لفظ کا تعلق ہے تو وہ مشک ہے۔قرآن کہتا ہے:''يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ خِتَامُهُ مِسْكٌ''[11] (سورۃ المطففین، آیت:۲۵) ''اور انھیں مہر بند امرت پلایا جائے گا، اس کی مہر کستوری ہے۔''

عربی زبان میں سنسکرت کے بعض دوسرے الفاظ استعمال ہوئے ہیں،جن میں ''صندل'' اور

''عود''(دونوں خوشبو کی لکڑی)، ساگوان (ساگوان کی لکڑی)، لونگ، کالی مرچ، کوسٹس، اطریفل، دازی یا تاری (ایک قسم کا مشروب) شامل ہیں۔، ناریل اور قرمز (ایک قسم کی سرخ رنگ) اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ۔

یہ تمام اجناس جو جنوبی ایشیا سے جزیرہ نمائے عرب میں درآمد کی جاتی تھیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں نے ان کو اپنی ساحلی تجارت کے ذریعے مصر اور یورپ تک پہنچانے میں بڑا کردار ادا کیا۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ سمندری تجارتی راستوں پر بہت سی جگہوں کا ایک سلسلہ ہے جس کے آخر میں لفظ "bar" لگا ہوا ہے، جیسا کہ مشرقی افریقہ کا جزیرہ زنجبار، یمن میں شہر زنجبار اور ہندوستان کی ریاست کیرالہ میں مالابار، اور جزائر انڈمان میں نکوبار، راجستھان میں کالابار اور تمل ناڈو میں ٹرانکوبار۔ لفظ ''بار'' سنسکرت کے لفظ ''وار'' سے ماخوذ ہوسکتا ہے جیسے لفظ کاٹھیاواڑ، یا فارسی زبان کے لفظ ''پور'' سے نکلا ہو جیسے نیشاپور، یا یہ عربی لفظ ''بار'' سے ماخوذ ہو جس کا مطلب ہے زمین۔

عرب ملاحوں نے بحر ہند کے خطے میں تجارت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہندوستان اور افریقہ سے سمندر کے ذریعے اور جزیرہ نما عرب کے مغربی ساحل کے ساتھ مسالوں کی تجارت میں عربوں کی ایک بڑی شراکت تھی۔

عربوں کا تسلط اور ساحلی تجارت پر ان کا کنٹرول اس وقت ختم ہوا جب مغربی مما لک جیسے پرتگال، جرمنی، برطانیہ اور دیگر مما لک نے ہندوستان پر حملہ کر کے بحر ہند کے ساحلوں پر قبضہ کرلیا۔

مصادر ومراجع:

۱۔ فتوح البلدان —— احمد بن یحییٰ البلاذری ابن جابر البغدادی،، مطبعة الموسوعات، القاہرہ، ۱۹۰۱ء

۲۔ موسوعة التاريخ الاسلامی (جلد:۸) ڈاکٹر احمد شلبی ،مکتبة النهضة المصرية (القاهرة) ۱۹۹۷ء

۳۔ تاريخ المسلمين فی شبه القارة الهندية وحضارتهم (دوجلدیں) ڈاکٹر احمد محمود الساداني، ملتزم الطبع والنشر، مكتبة الأداب مصر، سنہ طباعت غیر مذکور۔

۴۔ ديوان الأعشى، طبعة وزارة الثقافة والفنون والتراث، ادارة البحوث والدراسات الإسلامية، الدوحة، قطر ۲۰۱۰ء

۵۔ ديوان طرفة بن العبد،طبعة دار الكتب المصريه(۲۰۰۲ء)ص:۱۹،احمد بن یحییٰ البلاذری ابن جابر

البغدادی،فتوح البلدان، مطبعة الموسوعات (القاهرة)۱۹۰۱ء،
۶۔ الثقافة الإسلامية فی الهند — علامہ عبدالحی حسنی (دمشق)۱۹۵۸ء
۷۔ تاریخ الاسلام فی الهند — ڈاکٹر عبدالمنعم النمر، دار العهد الجديد للطباعة، مصر، طبعه أول ۱۹۵۹ء
۸۔ تاريخ الصلات بين الهند و البلاد العربية — ڈاکٹر محمد اسماعیل ندوی،طبعه أول، دار الفتح للطباعة و النشر، سنه طباعت غير مذكور.
۹۔ العلاقات العربية الهندية — ڈاکٹر سید مقبول احمد، الدار المتحدة للنشر، بیروت
۱۰۔ مختصر تاریخ هند — سید ابوظفر ندوی،طبعة ثالث، مطبعة المعارف اعظم گڑھ (یوپی)۱۹۸۹ء
۱۱۔ اسلامی ہند کی عظمت رفتہ — قاضی اطہر مبارکپوری، ندوۃ المصنفین (دہلی) ۱۹۶۹ء
۱۲۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں — قاضی اطہر مبارکپوری، ندوۃ المصنفین (دہلی)۱۹۶۷ء

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری *

مولانا عبیداللہ سندھی پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کی تالیفات وترتیبات

پیش لفظ، دیباچے اور مقدمے

مجھے جن بزرگوں سے عقیدت ہے ان میں صف اول کی شخصیات میں حضرت سندھی کا نام شامل ہے۔ میں نے اپنی علمی زندگی کے آغاز ہی سے ان پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اولاً مقالات لکھے تھے جو اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۹۴ء میں مولانا سندھی کی وفات کو پچاس برس پورے ہونے والے تھے، خاکسار نے اپنے دوستوں کے مشورے سے ۱۹۹۳ء میں حضرت مولانا پر تالیف و تدوین کتب کا ایک منصوبہ بنایا تھا، جس کے تحت کراچی اور لاہور سے ۱۹۹۴ء اور اس کے قریبی زمانے میں نصف درجن سے زیادہ کتابیں شائع بھی ہوئیں۔ اس سلسلے کی چند کتابیں اس کے بعد شائع ہوئیں اور ایک کتاب ہندوستان سے شائع ہوئی۔

اب ان میں سے ایک دو کتابوں کے سوا کوئی کتاب بازار میں بھی دستیاب نہیں۔ اس لیے مناسب یہ سمجھا کہ پہلی کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات اور ان کے دیباچے یا مقدمے جمع کر دیے جائیں جن کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں ہوسکتا۔ یہ کام ذاتی ذوق کی تسکین کے علاوہ مولانا

* مشہور محقق ومؤرخ اور مصنف

سندھی کے محققین اور مصنفین کے لیے بھی افادیت کا حامل ثابت ہوگا۔

تالیفات وتصنیفات کے سلسلے میں ستمبر ۱۹۹۴ء میں بہ مقام کراچی ایک سیمینار منعقد کیا گیا۔ سب سے پہلے اسی کے تذکرے اور پھر دیگر تالیفات کے بیان سے یہ باب آراستہ کیا جا رہا ہے۔

۱۔مقالات مولانا عبیداللہ سندھی سیمینار، کراچی ۱۹۹۴ء

یہ سیمینار مولانا عبیداللہ سندھی نیشنل کمیٹی پاکستان کے زیرِ اہتمام ۸، ۹ر ستمبر ۱۹۹۴ء کو منعقد ہوا تھا۔اس کے مقالات کا مجموعہ ''مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی پاکستان-کراچی کے زیرِ اہتمام شائع ہو چکا ہے۔مجموعے کے شروع میں محمد فاروق قریشی سیکریٹری سیمینار کمیٹی نے سیمینار کی روداد مرتب کر دی ہے۔ خاکسار نے سیمینار کی افتتاحی نشست میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

افتتاحیہ

حضرات گرامی قدر! آج ہم امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی زندگی، شخصیت، سیرت اور افکار وخدمات کے تذکرے اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ہمارا یہ مجمع حضرت مولانا کے پچاس سالہ یومِ وفات کی تقریبات کا ایک حصہ ہے۔

حضرات! ہمارے بزرگوں کی زندگیاں تقویم کے ایام وشہور یا کسی کیلنڈر رایئر کے کسی چھوٹے یا بڑے دن میں پیدائش ووفات کے تعلق سے تذکرے کی رہین منت نہیں۔ان کی یاد کے لیے کسی خاص موسم یا فصل گل کی بھی ضرورت نہیں۔ان کا وجودِ گرامی تاریخ کی ایک سچائی اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھا۔اس لیے کوئی موسم ہو، بہار وخزاں کا کوئی دور ہو، ان کی یاد ہماری تعلیم وتہذیب اور تربیت کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ہم ان کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہو سکتے۔

یہ نغمہ فصلِ گل ولالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ!

ان سب کی عظمت ان کی شخصیت کا حسن، سیرت کے محاسن، افکار کی بلندی اور قوم ووطن کی خدمات، قیام ملت اسلامیہ کے لیے ایثار اور احیائے اسلام کے لیے جان ومال کی بے مثال قربانیوں کی

وجہ سے ہے۔ان بزرگوں کی عظمت کا تعلق کسی خاص تاریخ ومقام میں پیدائش کی وجہ سے نہیں،لیکن قوم کے اس ذوق وعادت کیا کہا جائے کہ ہم نے نزولِ قرآن عظیم اور ولادتِ نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی سعادتوں تک کو خاص ایام منانے کی رسم تک محدود کر دیا ہے۔ ہماری قوم ان سعادتوں کے نزول اور ظہور و بعثت ایام کا جشن مناتی ہے،لیکن افسوس کہ ان سعادتوں کے حصول کی خود سعی نہیں کرتی۔

حضرات! ہم اس قسم کی یاد منانے کے قائل نہیں! ہم تو اپنے اسلاف کی سیرت اور ان کے افکار کے محاسن کے جویا ہیں۔ہم ان کے روشن کارناموں اور عظیم الشان خدمات کو مشعلِ راہ بنانا چاہتے ہیں۔ہم اس عہدِ سعادت اور دورِ علم وتہذیب کی بازیافت کے کوشاں ہیں،جس کے سانچوں میں علم وعمل کے جامع اور ایثار وقربانی کے مجسمے اور اخلاق وسیرت کے یہ حسین پیکر ڈھلا کرتے تھے۔

حضرات! ہم صرف مولانا سندھی کی تنہا شخصیت کی یاد منانا اور یادگار قائم کرنا نہیں چاہتے بلکہ مولانا سندھی کے شیوخ،اساتذہ اور ان کے معاصرین میں سے بے شمار شخصیات کی یاد منائیں گے، لیکن اس طرح کی ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہو،ان کے علوم وافکار سے ہمارے سینے معمور اور دماغ روشن ہوں،ان کی زندگی ہمارے لیے نمونہ ہو،ان کے کارنامے اور ایثار ہمارے لیے مشعلِ راہ ہوں۔ یہاں تک کہ ہمارے نوجوانوں کی زندگیاں اپنے اسلاف کی یادگار اور نمونہ بن جائیں۔

حضرات گرامی قدر! مولانا عبید اللہ سندھی اسلام کے خدمت گزاروں اور حق پرستوں کے جس قبیلے،ایثار پیشگانِ ملت کے جس قافلے اور تجدید واحیائے اسلام کی تحریک کے جس سلسلۃ الذہب سے تعلق رکھتے تھے،اس کی مختلف کڑیاں صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ کو محیط ہیں اور ان کے علم وعمل اور سیرت وافکار کی تابانیوں نے انھیں ہر دور میں اور ہر مقام پر بنایا ہے۔ان میں سے ہر شخص مجموعۂ صفات ہے،لیکن حضرات! اس وقت ہمارا موضوع اور اس سیمینار کے انعقاد کا مقصد امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی کی شخصیت کا تذکرہ اور ان کے افکار اور کارناموں پر تبصرہ ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی شخصیت میں فیضانِ الٰہی سے علم وعمل،فکر وسیرت،اور اخلاق و تہذیب کی بے شمار خوبیاں جمع ہوگئی تھیں،وہ ذہنی و دماغی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ان کے علم وفکر، سیرت اور خدمات ملت اسلامیہ اور تالیف وتدوین اور شرح وتفسیر علم وفن کی جو خوبیاں دنیا پر ظاہر ہوئیں اور اصحاب علم ونظر نے جن کا اعتراف کیا،وہ یہ تھیں کہ مولانا سندھی ایک مستند اور بلند پایہ عالم دین تھے،

فقہ وحدیث اور تاریخ عالم واسلام میں ان کی گہری نظر تھی، علوم قرآنی کے وہ بے مثال عالم تھے، وہ بلند پایہ مفسر قرآن تھے اور تفسیر میں ایک خاص انداز و دبستان فکر کے مالک تھے جسے مفکر ملت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے صوفیاء کے طریق **تفسیر التعلیل و التعبیر** سے مماثل قرار دیا ہے۔ وہ حکیم الہند امام ولی اللہ دہلوی کے علوم ومعارف کے سب سے بڑے محقق وشارح تھے اور ان کی اس خوبی کا ان کے نکتہ چینوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ انھیں ایک بڑی سعادت یہ حاصل تھی کہ وہ بہ واسطہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن محدث دیوبندی جدید ہندوستان کی سب سے بڑی علمی اور احیائے اسلام وقیام ملت کی عظیم الشان ولی اللّٰہی تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ مطالعہ علوم میں اور ملک کی سیاست میں حضرت شیخ الہند نے ان کی رہنمائی اور تربیت فرمائی تھی۔ انھوں نے وطن اور خصوصاً مسلمانوں کی تعلیم واصلاح کے لیے مختصر اور طویل متعدد اسکیمیں بنائیں جن کی صرف نظری حیثیت ہی نہیں عملی اہمیت بھی تھی۔ ان کا علمی مطالعہ بہت گہرا اور تجربہ ومشاہدہ نہایت وسیع تھا۔ انھوں نے زندگی کے نشیب وفراز اور کئی ممالک واقوام کے انقلابوں کو اتنے قریب سے دیکھا تھا کہ کم ازکم ہندوستان و پاکستان کے کسی سیاسی رہنما کو یہ موقع نہیں ملا تھا۔ انھوں نے پوری نصف صدی اسلام، مسلمانوں اور اہل وطن کی خدمت میں بسر کی تھی۔ یہ امتیاز برصغیر میں شاید ایک ہی دو رہنماؤں کو حاصل ہوا ہوگا۔ انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے پوری ربع صدی جلا وطنی کی زندگی گزاری تھی۔ یہ بھی ان کا ایک ایسا امتیاز تھا جس میں پورے برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں ایک دو کے سوا کوئی ان کا شریک نہ تھا۔

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم ۱۸۷۲ء میں سیال کوٹ (پنجاب) کے ایک گاؤں چیاں والی میں ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۶/برس کی عمر میں انھوں نے اسلام قبول کیا، ۱۸۹۷ء میں دارالعلوم دیو بند سے فراغت حاصل کی۔ انیسویں صدی کے آخری تین برس انھوں نے قصبہ امروٹ (سندھ) میں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں بسر کیے۔ اسی زمانے میں انھوں نے سیاسی زندگی کا آغاز کیا، ۱۹۰۱ء میں دارالرشاد کے نام سے گوٹھ پیر جھنڈا میں مدرسہ قائم کیا۔ ۱۹۱۰ء میں حضرت شیخ الہند نے انھیں دیو بند طلب فرمایا اور دارالعلوم کے طلبہ کی تنظیم کا کام سپرد کیا۔ مولانا سندھی نے جمعیت الانصار کے نام سے ایک انقلابی جماعت قائم کی۔ ۱۹۱۳ء میں نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے دہلی میں مدرسہ قایم کیا۔ ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند کے حکم سے کابل (افغانستان) تشریف لے گئے۔ کابل

میں انھوں نے ہندوستان کی آزاد عارضی حکومت میں شرکت کی اور اس کے کاموں میں رہ نمائی کی، جنود ربانیہ (نجات دہندہ فوج) کی تشکیل کی۔ ملک سے باہر پہلی کانگریس کمیٹی قائم کی۔ وہ عارضی حکومت میں وزیر داخلہ تھے، نجات دہندہ فوج کے بانی اور قائم مقام جنرل تھے اور کانگریس کمیٹی کابل کے بانی صدر تھے۔ ۱۹۱۹ء کی جنگ افغانستان مولانا سندھی کے منصوبے کے مطابق لڑی گئی، جس کے نتیجے میں افغانستان آزاد ہو گیا۔ مولانا سندھی کو اس کی قیمت میں افغانستان چھوڑنا اور ایک نئے ملک میں جلاوطنی کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ ۱۹۲۲ء میں روس پہنچے اور تقریباً سات ماہ ماسکو میں مقیم رہے۔ اس دوران روسی انقلاب، اس کے فلسفے اور اس کے پس منظر اور پیش منظر کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا، جولائی ۱۹۲۳ء میں روسی حکومت کے ساتھ ایک معاہدے کے بعد وطن عزیز کی آزادی کے ایک خفیہ منصوبہ کے تحت ترکی پہنچے اور تین سال استنبول میں مقیم رہ کر جدید ترکی کی سیاست اور اس کے پس منظر کا مطالعہ کیا۔ اس دوران انھوں نے برصغیر پاک و ہند کے سیاسی مسئلے کا ایک حل دریافت کیا اور برصغیر کے لیے سیاسی نظام پر مبنی ایک جامع الاطراف اسکیم تیار کی۔ اس اسکیم میں ملک کے فرقہ وارانہ، مذہبی، لسانی، اقتصادی، معاشی، تعلیمی، تہذیبی اور ریاستوں اور علاقوں اور صوبوں کے ہمہ قسم کے چھوٹے بڑے مسائل کا حل پیش کیا۔ اس میں مسلمانوں اور دوسری چھوٹی قومیتوں کے خدشات کو دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی اہمیت کا اعتراف وقت کے مسلمان اور غیر مسلمان زعما نے کیا ہے، جن میں مولانا محمد علی، شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، علامہ اقبال، پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ شامل ہیں۔

۱۹۲۶ء میں حج کے موقع پر موتمر اسلامی میں شرکت کے لیے متعدد زعمائے ملت حجاز پہنچنے والے تھے۔ مولانا کے علم میں یہ بات آئی تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ انھیں ملک کے ان اہل نظر اور اصحاب تدبر سے رابطہ پیدا کرنا چاہیے۔ مولانا حجاز روانہ ہو گئے لیکن مختلف اسباب کی بنا پر انھیں راستے میں اتنی دیر ہو گئی کہ موتمر ختم ہو گئی تھی اور زعما وطن لوٹ گئے تھے۔ مولانا نے سیاسی کام نہ کرنے کے وعدے پر حجاز میں پناہ حاصل کر لی اور ساڑھے بارہ برس مکہ مکرمہ میں قیام کیا۔ یہ تمام عرصہ انھوں نے امام ولی اللہ دہلوی اور اس سلسلے کے دوسرے بزرگوں کی تصنیفات کے مطالعے، قرآن حکیم میں نظر و تدبر، تاریخ اور عالمی سیاسیات کے مطالعے اور درس و تدریس کے مشاغل میں بسر کیا۔ اس عرصے کے مطالعہ و تدبر علوم و افکار ولی اللّٰہی میں ان کا رسوخ و تجربہ بہت پختہ و وسیع ہو گیا تھا۔ انھیں بعض دوستوں کی عنایت سے

ہندوستانی اخبارات و رسائل اور ہر طرح کی کتابیں پڑھنے کو مل جاتی تھیں اور عمرہ و حج کو پہنچنے والے مسافران حجاز کے ذریعے ان حالات سے بھی واقفیت ہوتی رہتی تھی، جن کے لیے اخبار اور رسایل و کتب کا مطالعہ کافی نہیں ہو سکتا تھا۔

مولانا سندھی نے مکہ مکرمہ کے دوران قیام ہی میں غور و فکر سے جلاوطنی کے خاتمے کے بعد وطن میں کام کرنے کا ایک ہمہ جہت منصوبہ بنالیا تھا، جس کا اظہار انھوں نے جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کے سیاسی پروگرام، بیت الحکمت کے علمی و تعلیمی منصوبے، کانگریس میں فکر ولی اللّٰہی پر بنی اپنی پارٹی بنانے اور جمعیۃ علمائے ہند کے لیے نئے نظام کار کی تجویز کے سلسلے میں ہوا ہے۔

۱۹۳۱ء کی سول نافرمانی کی تحریک نے برطانوی حکومت کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر نظر ثانی کرے۔ مسلمان اور غیر مسلمان انقلابی قوتوں نے برٹش استعمار کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ۱۹۳۵ء کی آئینی اصطلاحات، انتخابات، صوبائی قومی حکومتوں کے قیام، پھر جنگِ عظیم ثانی کے بعد کی سیاسیات پر مثبت اور منفی اثرات نے برطانوی استبداد کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اسی دوران جب کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد براعظم ہند پاکستان کے صوبہ جات میں قومی حکومتوں کا قیام عمل میں آیا تھا، مولانا سندھی نے وطن واپس لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس وقت ان کا وطن میں ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے انگریزی حکومت کی یہ شرط مان لی کہ وہ تشدد اور قوت کے ذریعے سے انقلاب لانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ کانگریس کے فلسفہ عدم تشدد کے پابند رہیں گے، لیکن انھوں نے اپنے جی میں، جیسا کہ ملک واپس آنے کے بعد ان کے اعلان و عمل سے ثابت ہوا، یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ اپنی قوتوں کو کانگریس کے حوالے کر دینے کے بجائے کانگریس میں ایک انقلابی اور ترقی پسند جماعت بنانے اور کانگریس کو اس کے پروگرام کے مطابق چلانے کی کوشش کریں گے۔ چناں چہ اس فیصلے کے مطابق حکومت سندھ کی ضمانت پر، اللہ بخش شہید سومرو کی وزارت کے زمانے میں وہ وطن واپس آ گئے۔ ۷/ مارچ ۱۹۳۹ء کو انھوں نے ۲۵ برس کی جلاوطنی کے بعد کراچی کے ساحل پر قدم رکھا تھا۔

اس تاریخ کے بعد ان کی وفات تک زندگی کے تمام شب و روز ملک کی آزادی، قوم کی تربیت

اور ملت کی غم گساری میں بسر ہوئے۔اس زمانے میں انھوں نے''جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کو عملاً قائم کیا اور سندھ کے اہل ہمت اور وطن کی خدمت کے شایقین کو سرگرم عمل کیا۔ جمعیۃ خدام الحکمۃ کے نام سے انسانی خدمت گذاروں کی ایک تنظیم قائم کی ، ملک کو فرقہ واریت سے بچانے کے لیے جدو جہد کی ، کانگریس کو گاندھی ازم کے سانچوں میں ڈھل جانے سے روکا،مسلمان انقلابی جماعتوں کو رجعت پسندی کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور رجعت پسند مسلمان جماعتوں کو مذہب کے نام پر سیاست میں زہر گھولنے اور فضا کو مسموم بنانے سے باز رہنے کی تلقین کی۔ٹھیک اس وقت جب وہ سیاسی اعمال انجام دے رہے تھے مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے فرایض سے بھی غافل نہ تھے۔اس سلسلے میں بیت الحکمت کے نام سے یادگار شیخ الہند مولانا محمود حسن دہلی میں قائم کی اور اس کی شاخیں لاہور، کراچی، گوٹھ پیر جھنڈا، امروٹ اور دین پور میں قائم کیں۔ مدارس اسلامیہ کے قیام اور تعلیم کی اشاعت کی تحریک پیدا کی۔وہ شب وروز قوم ووطن کی خدمت اور قیام ملت اسلامیہ کے انھیں عظیم الشان کاموں میں مصروف رہے، تا آنکہ وقت موعود آ پہنچا۔۲۱راگست ۱۹۴۴ء کو دین پور میں انھوں نے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کی زندگی کا یہ مختصر خاکہ ہے۔آج ہم ان کی یاد منانے، ان کی شخصیت کی عظمت کا اعتراف کرنے اور ان کے افکار و خدمات کے تذکرہ وتبصرہ کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔دودنوں میں تین نشستوں میں انتظام کیا گیا ہے جس میں مولانا سندھی کی شخصیت اور افکار و خدمات کے مختلف پہلوؤں پر بہت سے مقالے پیش کیے جائیں گے۔

حضرات! مولانا سندھی کے مطالعے کی اہمیت کے دو پہلو ہیں۔ایک تو گذشتہ تاریخ سیاست ملت اسلامیہ ہند کے حوالے سے ، دوسرے آج کے قومی ، لسانی ، مذہبی ، تہذیبی ،صوبائی علاقائی ، اقتصادی، معاشی مسائل کے حوالے سے! مولانا سندھی پنجاب میں پیدا ہوئے۔سندھ کے لوگوں سے عقیدت وارادت کا رشتہ استوار کیا۔ یوپی کے اضلاع دیوبند،لکھنؤ، رام پور، گنگوہ اور دہلی کے اساتذہ سے تعلیم پائی۔سندھ کی سرزمین کو خدمت علمی وعملی کے لیے میدان منتخب کیا اور اپنے آپ کو سندھی کہلوانے اور لکھنے میں فخر محسوس کیا۔مولانا سندھی محض مکتبی مُلّا نہ تھے، وہ ایک روشن خیال اور بالغ نظر رہبر بھی تھے۔تاریخ اسلام اور عالم اسلام کی علمی ،فکری اور اقوام عالم میں اقتصادی، معاشی تحریکات اور سیاسیات میں گہری نظر رکھتے تھے۔وہ ولی اللّٰہی مکتب فکر کی بہت اہم شخصیت تھے اور خود ایک نظام فکر کے

مالک تھے۔ ان کے فکری نظام میں فرد کی تعلیم و تربیت سے لے کر متحدہ انسانیت کے قیام تک زندگی کے تمام درجوں اور سطحوں کے لیے ان کی ضرورت و اہمیت کے مطابق ہر چیز کا ایک مقام تھا۔ ان کے اندازِ فکر اور افادات و افکار میں ہمارے لیے وقت کی بہترین رہ نمائی ہے۔

مولانا سندھی کے تذکرے میں یہ سمینار آئندہ انھیں بھول جانے کے لیے منعقد نہیں کیا گیا بلکہ یہ ایک علمی اور فکری تحریک کا آغاز ہے۔ مولانا سندھی اس سلسلے کی پہلی اور آخری شخصیت نہیں جن پر سمینار کا انعقاد کیا گیا اور تصنیف و تالیف اور تدوین افکار کا پروگرام مرتب کیا گیا ہے، بلکہ مولانا سندھی کے سلسلہ اکابر و اسلاف، مشائخ عظام اور اساتذہ کرام اور ان کے معاصرین پر جو ولی اللّٰہی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں، سب پر حالات و وسائل کی وسعت کے مطابق سمینار بھی مرتب کیے جائیں گے اور تالیف و تصنیف کے کام بھی انجام پائیں گے۔

حضرات گرامی قدر! میں جمعیت طلبائے اسلام (صوبہ سندھ و کراچی) کے ارکان و کارکنان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے مولانا عبید اللہ سندھی نیشنل کمیٹی پاکستان سے اس سمینار کے انعقاد میں تعاون کیا۔ میں ان حضرات کا بھی شکرگذار ہوں جنھیں مولانا سندھی کی عقیدت اور ارادت اس سمینار میں کھینچ لائی ہے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

۲۔ امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی شخصیت و سیرت

یہ مختلف اہلِ قلم کے سندھی زبان میں مضامین کا مجموعہ ہے البتہ 'پیش لفظ' مرتب کے قلم سے اردو زبان میں ہے۔ درج کیا جاتا ہے:

پیش لفظ

مولانا عبید اللہ سندھی ہماری قومی تاریخ کی ایک بلند پایہ شخصیت اور ملت اسلامیہ ہند پاکستان کا سرمایہ افتخار تھے۔ انھوں نے وطن کے عشق میں اور ملت اسلامیہ کی سربلندی کے لیے وطن مالوف میں مقیم زندگی کے عیش و راحت کے مقابلے میں غربت اور جلاوطنی کی چوبیس سالہ زندگی کو قبول کیا

تھا اور اس زندگی میں ہر طرح کے آلام ومصائب کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر لیا تھا۔

وہ جنگ آزادی کے سورما، انقلابی رہ نما، بلند پایہ عالم دین، مفسر قرآن، ایک خاص دبستان تفسیر کے بانی، امام ولی اللہ دہلویؒ کے علوم ومعارف کے سب سے بڑے شارح ومحقق اور دورہ آخر کے مستقل امام تھے۔ ان کے افکار کا سرچشمہ قرآن حکیم اور علوم ومعارف ولی اللٰہی تھے۔

مولانا سندھی سیال کوٹ (پنجاب) کے ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا۔ سندھ کے بزرگوں نے انھیں پیچھا کرنے والے خطرات سے بچایا تھا اور ان کے لیے مامن اور سایہ عاطفت فراہم کیا تھا۔ اس لیے ان بزرگوں کی محبت میں انھوں نے سندھ کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اس طرح آبائی سندھی اور فرزند زمین نہ ہونے کے باوجود انھوں نے سندھ کو اپنی پہچان بنایا اور اپنے تئیں سندھ کا ایک نامور اور قابل فخر سپوت ثابت کر دکھایا۔ ان کی زندگی اور سیرت میں ان لوگوں کے لیے جنھیں کسی وجہ سے اپنا آبائی وطن چھوڑنا اور مامن کی تلاش میں کسی نئی سرزمین کو اپنا وطن بنانا پڑا ہو، ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ اسلام قبول کر لینے کے بعد انھوں نے مسلمانوں کی تہذیب وروایات اور تاریخ سے اپنا رشتہ جوڑ لیا تھا لیکن وہ جدید دور کے ایک اعلیٰ دماغ، روشن خیال اور بلند فکر انسان بھی تھے۔

وہ مسلمانوں کی انفرادی زندگی کی اصلاح، فکر کی تربیت، اخلاق کی تہذیب، سیرت کی تشکیل اور اجتماعی قومی زندگی کی تنظیم سے لے کر متحدہ انسانیت کے قیام تک کے لیے ایک جامع فکر کی حامل شخصیت تھے۔ ان کے انقلابی افکار میں ملک کی تعمیر وترقی، قومی حکومت کے قیام اور معاشی، اقتصادی، مذہبی فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لیے وقت کی سب سے بڑی رہ نمائی پوشیدہ ہے۔ اس وقت پاکستان میں لسانی اور علاقائی قومیت کے بڑھتے ہوئے رجحانات، مذہبی جنون کے پھیلتے ہوئے زہر، لاقانونیت کے پرورش پاتے ہوئے عفریت، علاحدگی پسندی کے پھیلتے ہوئے تباہ کن نظریات اور بے دینی کے پھوٹ پڑنے والے فساد کا تریاق ہے اور انھیں کی بنیاد پر سماجی اور قومی زندگی کی تشکیل ہی پاکستان کو ایک مسلم اسٹیٹ رکھتے ہوئے تمام ملکی وقومی مسائل کو حل کر سکتی ہے اور اقوام عالم میں پاکستان کے بلند مقام کی ضمانت ثابت ہو سکتی ہے۔ مولانا سندھی کے افکار کو اپنائے بغیر طبقاتی کشمکش کا حل دریافت کیا جا سکتا ہے نہ فرقہ واریت کے فتنے کا سدِ باب ممکن ہے اور نہ پاکستان کے رفاہی وفلاحی مملکت بنانے کا خواب

شرمندۂ تعبیر ہونا ممکن نظر آتا ہے۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کی شخصیت کے انھیں خصائص سے متاثر ہو کر امسال ان کے پچاس سالہ یوم وفات کی تقریب سے جو پروگرام مرتب کیا تھا، اس میں اخبارات و رسائل کی خصوصی اشاعتوں کے اہتمام اور سمیناروں کے انعقاد کے ساتھ اور انگریزی اور سندھی میں کتابوں کی تالیف واشاعت بھی شامل تھی۔ الحمدللہ کہ اندرون ملک کراچی، لاہور، راولپنڈی میں اور بیرون ملک لندن اور برمنگھم میں متعدد سمینار منعقد ہو چکے ہیں، اردو، سندھی میں کئی رسائل کے نمبر شائع ہوئے ہیں اور ہندوستان پاکستان سے ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو رہی ہیں، امید ہے کہ اس نمبر کی اشاعت تک تقریباً نصف درجن کتابیں حضرت امام کی شخصیت، سیرت، افکار، خدمات اور پیغام کے تذکرہ و تعارف میں شائع ہو چکی ہوں گی۔ یہ کتاب بھی حضرت سندھی کی شخصیت، سیرت اور افکار کے تعارف میں اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

یہ کتاب سندھی زبان کے چند نامور اہلِ قلم کی یادگار تحریروں کا مجموعہ ہے، جن میں مولانا دین محمد وفائی، حکیم مولوی محمد معاذ، سردار محمد امین خان کھوسو، مولوی شیخ عبدالمجید امجد سندھی، مولانا عزیز اللہ جروار، مولانا ابوسعید غلام مصطفیٰ قاسمی جیسے اہلِ نظر واصحابِ علم وعمل شامل ہیں۔ یہ تمام حضرات مولانا سندھی سے خاص تعلق اور نسبت تلمذ رکھتے ہیں، ان کے فیضانِ صحبت سے بہرہ مند ہوئے ہیں، ہر کسی نے بہ قدر ظرف حضرت امام سے استفادہ کیا ہے اور اپنے جیب ودامن کو بہ قدر وسعت افکار کے موتیوں اور علم کے جواہر پاروں سے حضرت کی زندگی ہی میں بھر لیا تھا۔ اس سعادت نے انھیں بعد کے تمام اہل علم ونظر اور اصحاب قلم سے ممتاز کر دیا ہے۔ ان میں سے اول الذکر تین حضرات وفات پا کر جوار رحمت الٰہی میں جگہ پا چکے ہیں، دیگر حضرات بحمداللہ حیات ہیں اور اپنے اپنے دائروں میں اپنی اپنی بساط کے مطابق ملک وقوم اور دین وملت کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔[۲]

مجھے امید ہے کہ سندھ کے اہلِ قلم اور اصحابِ ذوق میں مضامین کا یہ مجموعہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور پسند کیا جائے گا۔ اس مجموعے کی اہمیت اور افادیت کے فیصلے کو قارئین کرام کی رائے گرامی پر چھوڑتا ہوں۔ اگر معمولی درجے میں قارئین کی مختصر تعداد بھی اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکے تو میں اسے اپنی سعی کا حاصل سمجھوں گا۔

اس کتاب کے بعض مضامین عزیزم ثناءاللہ سومرو نے فراہم کیے، ایک مضمون کا ترجمہ بھی ان کی کاوش ہے اور کمپوزنگ کے انتظام اور پروف ریڈنگ کے لیے بھی آں عزیز نے زحمت اٹھائی۔ اس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

ابوسلمان

۱۵رنومبر۱۹۹۴ء

مولانا عبیداللہ سندھی—افکار وخدمات/مولانا دین محمد وفائی

حرفے چند

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے پچاس سالہ یومِ وفات کے پروگرام کے سلسلے میں حضرت مرحوم کے متعلق مواد کی تلاش ہوئی تو سب سے پہلے میں نے اپنے ہی ذخیرے کا جایزہ لیا۔ اتفاق سے ایک فائل میں مولانا دین محمد وفائی کے کچھ مضامین مل گئے کچھ اور مضامین کی فکر ہوئی تو مولانا عزیز اللہ جروار صاحب اور عزیزم ثناء اللہ سومرو سلمہ کی عنایت سے دست یاب ہو گئے اور اس یقین کے ساتھ کہ اب مولانا وفائی مرحوم کا شاید ہی کوئی مضمون حضرت امام سندھی کے متعلق اس مجموعے میں جگہ پانے سے رہ گیا ہو۔ بعض عزیزوں اور مخلصوں سے ترجمہ کی درخواست کی۔ خوشی ہوئی کہ یہ درخواست بھی شرف قبولیت سے محروم نہ رہی۔ ان عزیزوں اور مخلصوں کا شکر گزار ہوں۔

یہ مضامین مرتب ہو کر سامنے آئے تو اندازہ ہوا کہ ضخیم نہ سہی مختصر ہی ایک ایسی کتاب تیار ہوگئی جو حضرت مولانا دین محمد وفائی کے اسم سامی کی نسبت سے شرف پائے گئے۔

مولانا دین محمد وفائی حضرت سندھی کے بڑے معتقد اور ان کے افکار کے بہت شیدائی تھے۔ کچھ مدت تک انھوں نے قرآن حکیم کے علوم وافکار میں مولانا سندھی سے استفادہ کیا تھا اور محض رسمی طور پر نہیں بلکہ باقاعدہ زانوے تلمذ تہ کیا تھا۔ روزنامہ الوحید کراچی کی ادارت، جو ایک معقول ذریعۂ آمدنی کے علاوہ ایک باعزت ملازمت تھی، دراصل مولانا سندھی کے عشق کی نذر ہوئی تھی۔ مولانا وفائی قوم پرور مسلمانوں کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا سندھی کی صحبت نے انھیں ان عقائد میں اور بھی پختہ کر دیا تھا اور الوحید کی پالیسی اس کے ڈائریکٹرز کے ذوق ومصالح نے ان جذبات پر رکھی تھی جنھوں نے مسلمانوں کی تمیز اخلاق وتہذیب کو متاثر کر دیا تھا۔ مولانا وفائی کی بصیرت نے ان پر جس حقیقت کو واشگاف کر دیا تھا ممکن نہ تھا

کہ وہ اس سے انکار کر دیتے اور صرف ملازمت وعزت کی خاطر حالات سے مصالحت کر لیتے۔انھوں نے سوچا کہ جب عشق میں عزت سادات گنوانا ہی ٹھہرا تو آج اور کل کی کشمکش کیوں۔ بہ قول میر:

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور دامن جھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت مولانا سندھی دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا میں تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور علائق دنیا کی ٹوٹی ہوئی زنجیروں کے ٹکڑے حضرت مرحوم کے قدموں میں ڈھیر کر دیے۔ اس کے بعد سوائے اس کے کہ اہلِ حدیث مسلک کے مطابق دین کے تمام عقاید وعبادات میں تمسک بالکتاب والسنتہ کے تقاضے پورے کرتے رہیں، سیاسی افکار وعقائد میں انھوں نے حضرت سندھی کا جو مسلک علم وحق قبول کر لیا تھا، اس سے زندگی بھر سر مو تجاوز نہ کیا۔ نہ محض تقلیدا کی، بلکہ ان کے علم ونظر نے اس مسلک کی سچائی کو ان کے قلب پر واضح کر دیا تھا۔ مولانا سندھی مرحوم کی صحبت کا اثر اور نظر کا فیضان تھا کہ وہ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کے علوم ومعارف کے بہت شیدا ہو گئے تھے۔

ان مضامین کی تالیف میں ایک تصنیف کی شان تو پیدا نہیں ہو سکتی تھی، لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ جو معلومات وافکار اس مجموعہ مضامین میں آپ کے مطالعے میں آئیں گے وہ بعد کے کسی مصنف کی تحریروں میں نہیں مل سکتے۔ حضرت امام سندھی کی زندگی اور افکار کا یہ بنیادی مواد ہے، جو ان مضامین میں فراہم کر دیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت مسلم ہے۔ آئندہ حضرت امام سندھی پر تحقیق اور تالیف وتدوین اور تحریر وتصنیف کا جو دور شروع ہوگا، اس میں یہ مضامین عام طور پر بنیادی ماخذ قرار پائیں گے۔ امید ہے کہ اصحاب ذوق میں یہ کتاب پسند کی جائے گی۔

ابوسلمان سندھی شاہ جہان پوری

۴۔مولانا عبیداللہ سندھی ایک شخص سونے جیسا!/سردار محمد خان کھوسو

حرفے چند

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے پچاس سالہ یوم وفات کے یادگار پروگرام کے سلسلے

میں سردار محمد امین خان کھوسو مرحوم کے مضامین وخطوط کا یہ مختصر مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کی تالیف و تدوین واشاعت کا مقصد حضرت مولانا سندھی کی یاد کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ان کے عاشق صادق سردار کھوسو مرحوم کے افکار وافادات بھی مرتب ومحفوظ ہو جائیں۔

سردار محمد امین خاں ایک روایتی بلوچ سردار اور علمی سے زیادہ عملی انسان تھی۔ لیکن مولانا سندھی کے فیض صحبت ونظر نے انھیں کچھ سے کچھ بنا دیا تھا۔ مجھے ان کی نیاز مندی کا شرف حاصل ہوا۔ انھیں دیکھ کر سمجھ میں آیا کہ انقلابی شخصیت کیا ہوتی ہے۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر محسوس ہوتا تھا کہ قلب جوش افکار سے پھٹ جائے گا۔ دنیا کی کسی قوت سے ٹکرا جانا ایک کھیل معلوم ہوتا تھا۔ ان پر ہمہ وقت ایک جنون وسرمستی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنی مشکل تھی۔ وہ نہ صرف اپنی زبان سے انقلابی افکار کو بلکہ اپنی نگاہوں سے انقلاب انگیز جذبات کو دل میں منتقل کر دیتے تھے۔ وہ خود کہا کرتے تھے، میں کیا تھا؟ زنگ آلودلو ہے کا محض ایک ٹکڑا! اب کیا ہوں؟ سونا ہوں سونا، کھرا سونا، ہر طرح کے کھوٹ اور میل سے پاک، خالص سونا! جانتے ہو، وہ کون سا پارس تھا جس نے اس زنگ آلودلو ہے کے ٹکڑے کو سونا بنایا؟ وہ امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی کی شخصیت اور ان کی صحبت کا اثر تھا۔ اس موقع پر وہ ایک خاص انداز میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

ایک روز میں نے کہا آپ کی یہ حالت ہے تو حضرت مولانا سندھی کی شخصیت کی انقلاب انگیزی کا کیا عالم ہوگا؟ بولے اس کا مقام آشنا تو ہندوستان میں کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔ جس زمانے میں وہ وطن میں لوٹ کر آیا اور جس دور میں وہ یہاں سرگرم عمل رہا، کسی کو اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ کوئی اس کی شخصیت سے کیا متاثر ہوتا۔

سب اپنی اپنی شخصیت کے سحر میں مبتلا اور اپنی اپنی اَنا کے گنبد میں محصور تھے۔ میں نے ان کی عظمت کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ لیکن میں وہ سب کچھ بیان نہیں کر سکتا۔ کاش میرے ہاتھ میں میرے جذبات کا ترجمان قلم ہوتا۔

حضرت مولانا سندھی کے حوالے سے جب میں نے ان سے استفادہ کیا تھا تو دیکھا تھا کہ وہ

جوش وجذبات سے بے قابو ہو جاتے تھے۔ جب وہ کوئی بات کہتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ان کے جسم کا رواں رواں مولانا سندھی کی انقلابیت کی پکار بن گیا ہے۔

وہ کہا کرتے تھے کہ ملک ایک استعمار سے آزاد ہو کر دوسرے استعمار کی گرفت میں چلا گیا ہے۔ یہ استعمار ایک نظام تھا جس میں عوام جکڑے ہوئے تھے، موجودہ استعمار عوام کے رگ وپے میں زہر بن کر اتر جائے گا۔ وہ اس آزادی کو قفس کی محض تیلیاں بدلنے کے عمل سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ملک کے عوام موجودہ استعمار سے کبھی آزادی ادی نہ حاصل کر سکیں گے الّا یہ کہ امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار ونصب العین کی بنیاد پر کوئی عوامی انقلابی تحریک پیدا کر دی جائے۔ وہ سندھ ساگر پارٹی کو ایک انقلابی پارٹی کی حیثیت سے منظّم کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اس پارٹی کی تنظیم میں ان کا ساتھ دوں گا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ وہ علمی نہیں ایک عملی آدمی تھے۔ اس لیے حروف وسواد کی صورت میں ان کے افکار کا سرمایہ بہت زیادہ نہیں لیکن میرے دسترس میں جو چند چیزیں تھیں، ان کی تربیت واشاعت کی طرف رہ نمائی کر دی ہے۔ بعض مضامین کی فراہمی اور اردو ترجمہ میں عزیزم ثناء اللہ سومرو کے اخلاص وتعاون کے لیے سراپا شکر گزار ہوں۔ اگر آن عزیز تعاون نہ کرتے تو یقیناً کئی مضامین رہ جاتے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ملک اور اس کے عوام کو امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے انقلابی افکار سے استفادے کی توفیق بخشے اور جو اہل ہمت مولانا سندھی کے افکار کے مطابق انقلاب کے لیے کام کر رہے ہیں ان کی ہمتوں کو بلند کرے اور ان کی آواز کو موثر بنائے۔

۵۔ ریشمی رومال تحریک اور سندھ/ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

پیش لفظ

تحریکِ ریشمی رومال کا ذکر سب سے پہلے سڈیشن کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۱۸ء میں آیا تھا۔ پھر ۱۹۲۴ء میں ان ٹیلی جینس نے تحریک خلافت اور ترکِ موالات پر اپنی رپوٹ مرتب کی تو اس میں ایک دو پیراگراف آئے۔ لیکن یہ برٹش حکومت کا نقطہ نظر تھا۔ ان معلومات کی روشنی میں تحریک ریشمی رومال کی تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی تھی۔ سب سے پہلے مفصل طور پر شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی خود

نوشت نقش حیات میں اس تحریک کا تعارف کرایا۔ یہ ایک اہم شخصیت کے قلم سے تحریک کی تاریخ تھی۔ لیکن جس طرح پہلی معلومات ایک تحریک کے بارے میں حکومت کا نقطۂ نظر تھا اسی طرح دوسری معلومات بھی حالات کا صرف ایک رخ تھا۔ اس کے کئی پہلو تشنہ بحث تھے۔ انھی معلومات کو مولوی عبدالرحمٰن نے انتہائی غلط اضافوں اور تبصروں کے ساتھ ایک نئی کتاب کی صورت میں پیش کیا۔ پھر جب انڈیا آفس لائبریری میں متعلقہ کاغذات کے مطالعے اور ان سے استفادے کی اجازت دی گئی تو مولانا موسیٰ بھائی کرناڈی اور ان کے رفقا نے تمام کاغذات کی فلم بنوا کر جمعیۃ علمائے ہند کو دی جس کے خاص حصوں کا ترجمہ کروا کے اپنے ایک طویل مقدمہ اور حواشی کے ساتھ حضرت مولانا سید محمد میاں نے تحریک شیخ الہند کے نام سے دہلی سے شائع کر دی (بعد میں لاہور سے اس کے دو ایڈیشن نکلے) اس سے پہلی مرتبہ تحریک کے بارے میں ہر جہت سے اور تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں اور اگرچہ مولانا سید محمد میاں نے سی آئی ڈی کی غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کو اپنے مقدمے میں بیان کر کے صحیح صورت حال کو پوری طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بنیادی طور پر یہ سی آئی ڈی کا ریکارڈ ہے جو مرتب کر دیا گیا ہے۔ ان معلومات کے علاوہ کچھ اور معلومات ایسے حضرات سے حاصل ہوئیں جو کسی نہ کسی حد تک تحریک سے فکری یا عملی طور پر وابستہ رہے تھے۔ ماہ نامہ الحق اکوڑہ خٹک میں اس قسم کی کئی مفید تحریریں نکلی ہیں۔

''تحریکات ملی'' کے سلسلے میں میرا ارادہ تھا کہ تفصیل و تحقیق کے ساتھ اس تحریک پر لکھنے کی آرزو پوری ہوگی لیکن جب اس عظیم الشان انقلابی تحریک پر قلم اٹھانے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ نہ وقت و فرصت ہے اور نہ تفصیل و تحقیق کے انتظار میں پیش نظر منصوبے کو التوا و تعویق میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اس لیے سی آئی ڈی کے مرتب کردہ سازش کیس کا خلاصہ اور استغاثہ پیش کر دینا ہی ممکن اور مناسب معلوم ہوا!

جیسا کہ عرض کیا یہ خلاصہ اور استغاثہ سی آئی ڈی یا ان ٹیلی جینس کے محکمے کا ترتیب دادہ ہے اور چونکہ عام مقدمات کی طرح یہ مقدمہ عدالت میں پیش نہیں کیا گیا تھا، نہ مدعا علیہ حکومت کے ہاتھ آئے تھے کہ وہ اپنی صفائی پیش کرتے اور دفاع کرتے اور نہ وکیل اور گواہ عدالت میں پیش ہوئے تھے کہ استغاثے کے بیان پر جرح سے اصلی حقیقت واضح ہوتی، بس چند افراد جو کسی نہ کسی طرح حکومت کے ہاتھ لگ گئے تھے، ان سے جو کچھ سی آئی ڈی غلط یا صحیح معلومات حاصل کر سکی، انھیں کی بنیاد پر یہ خلاصہ اور استغاثہ مرتب کر دیا گیا۔ پھر بھی خلاصے اور استغاثے میں تحریک کے جس پس منظر کو واضح کیا گیا، جو

ثبوت فراہم کیا گیا اور مسلمان رہ نماؤں میں جن روابط کی نشان دہی کی گئی ہے، وہ حقائق پرمبنی ہے یا حقیقت سے بہت قریب ہے۔ اس تحریک کے سب سے بڑے رہنما شیخ الہند مولانا محمود حسن اور دیگر رہنماؤں کے افکار، خیالات اور مذہبی و سیاسی مقاصد بلاشبہ وہی تھے جن کی طرف استغاثے میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ریشمی خطوط سازش کیس کے خلاصے اور استغاثے کے مطالعے سے اس کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ برعظیم کی یہ آخری انقلابی تحریک تھی اور حسن اتفاق سے اس کے رہنما پہلی اسلامی انقلابی تحریک (تحریک اصلاح و جہاد) کے رہنماؤں سے فکر و عقیدت کا رشتہ استوار رکھتے تھے۔

مناسب ہوگا کہ اس ترتیب کی بعض خصوصیات پر نظر رہے:

کیس کے خلاصے یا استغاثے کے بعض مقامات پر مولانا سید محمد میاں نے حواشی تحریر فرمائے تھے۔ اس ترتیب میں مولانا مرحوم کے بعض حواشی کو جوں کا توں رہنے دیا ہے اور ایسے ہر حاشیے میں مولانا مرحوم کے نام کی صراحت کر دی ہے۔ البتہ جہاں حواشی ناکافی معلوم ہوئے یا وضاحت کے متقاضی ہوئے وہاں نئے حواشی کا اضافہ کیا ہے، لیکن حاشیہ نگار کے نام کی صراحت ضروری نہیں سمجھی ایسے تمام حواشی راقم الحروف کے قلم سے ہیں۔ بعض نام ناکافی معلومات کی بنا پر یا سہو قلم و کتابت سے کچھ سے کچھ بن گئے تھے۔ انھیں درست کر دیا ہے۔ استغاثے کے بعض حوالے غلط تھے۔ مثلاً جمعیت حزب اللہ کے سلسلے میں الہلال کے متعلقہ شمارے کی تاریخ غلط تھی اور اقتباسات کئی بار کی نقل و ترجمہ میں بالکل مسخ ہو گئے تھے انھیں الہلال میں دیکھ کر اصل کے مطابق کر دیا ہے۔

سازش کے انکشاف کی بنیاد صرف تین خط اور دو تحریریں تھیں پھر چند اور تحریریں سی آئی ڈی کے ہاتھ لگیں جنھیں استغاثے میں بطور ثبوت پیش کیا گیا تھا۔ اس سلسلے کی اب تک صرف چند تحریریں لوگوں کے مطالعے میں آئی تھیں۔ چند مزید تحریریں جناب ضیاء الدین لاہوری کی سعی و توجہ سے دستیاب ہوئی ہیں جو آپ عکسی صورت میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ ان کی فراہمی کے لیے ہم جناب ضیاء الدین صاحب کے شکر گزار ہیں اور انڈیا آفس لائبریری کے ڈائریکٹر کی اجازت سے وہ تحریریں پیش کی جاتی ہیں۔

اس کوشش کا ابتدائی نقش علم و آگہی (گورنمنٹ نیشنل کالج۔ کراچی) کے تحریکات ملی نمبر

(۱۹۸۲ء) میں پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے اس سلسلے کا بنیادی مضمون ''تحریک ریشمی رومال اور سندھ'' کے عنوان سے بانی پاکستانی سے منسوب اسی علمی مجلّے کے ایک نمبر میں لکھ چکا تھا (۱۹۷۷ء)۔ چونکہ یہ دونوں کوششیں ایک ہی سلسلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس لیے انھیں بعض ترامیم و اصلاح کے بعد کتاب کی شکل میں یکجا کر دیا ہے۔ لیکن اس میں بعض اہم اضافے بھی ہیں۔

۱۔ پہلا ضروری اضافہ یہ مناسب سمجھا گیا کہ اس میں ریشمی خطوط کی ڈائریکٹری سے جو تحریک شیخ الہند (مرتبہ مولانا سید محمد میاں مرحوم) میں شامل ہے، مقدمے کے فریق ثانی (مولانا عبید اللہ وغیرہم) کے تمام افراد یعنی ملزمان مقدمہ کا تعارف بھی شامل کر لیا جائے۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ تعارف فریق اول نے استغاثے کی تالیف کے ساتھ اپنی سہولت کے لیے مرتب کیا تھا۔ اس میں بعض تاریخی و سوانحی غلطیاں تھیں۔ انھیں حواشی میں درست کر دیا ہے یا اضافہ و تفصیل سے گریز کرتے ہوئے کوئی اور ضروری اشارہ کر دیا ہے۔ ان افراد کے حالات کی تفصیل و تحقیق میں جانا بجائے خود ایک بڑا کام ہے۔ البتہ اس تحریک میں شامل سندھ سے متعلق شخصیات کے تعارف میں کسی قدر تفصیل و تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ یہ تعارف کتاب کے حصہ دوم میں ریشمی رومال تحریک اور سندھ کے رجال کار کے عنوان سے شامل ہے۔

۲۔ جن خطوط و تحریرات کی بنا پر انگریز حکومت نے اسے ریشمی خطوط سازش کیس بنایا تھا یا اسے ریشمی خطوط تحریک کا نام دیا تھا، وہ مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا محمد میاں انصاری کے خطوط تھے۔ ان دونوں بزرگوں کا تعلق چونکہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی آزادی وطن کی انقلابی اور ملی تحریک سے تھا اور ریشمی خطوط تحریک اور اس کے واقعی پس منظر کو سمجھنے کے لیے رولٹ کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ کے بعض اجزا اور بعض تاریخی دستاویزات کے مطالعے کی اہمیت تھی اس لیے ضمیمے کے تحت اس رپورٹ کے دو باب اور بعض دیگر تاریخی دستاویزات شامل کی گئی ہیں۔

۳۔ ایک مضمون جو حافظ محمد اسماعیل مرحوم شیخ الحدیث مدرسہ مظہر العلوم (محلّہ کھڑا، کراچی) نے اسی تحریک کے سلسلے میں اپنے والد گرامی مولانا محمد صادق علیہ الرحمہ کی کارگزاریوں کے تعارف میں لکھا تھا، جس کے ساتھ بعض تاریخی دستاویزات بھی شامل تھے اور سندھی ماہنامہ الصادق۔ کراچی (رمضان، شوال ۱۴۱۱ھ) میں شائع ہوا تھا اس کا ملخص ترجمہ بھی مع دستاویزات عکس کے شامل کر لیا ہے۔

یہ کتاب چوں کہ سندھ کے بطل جلیل اور تحریک استقلال وطن کے مشہور مفکر اور انقلابی مولانا

عبیداللہ کے پچاسویں یوم وفات کی تقریب سے بطور یادگار پیش کی جارہی ہے اس لیے اس تحریک میں سندھ کی رہنمائی اور اس کے ایثار وخدمات کا نقش پوری طرح اجاگر کرنے کی کوشش کی ہوئی ہے۔ اس لیے اس کا نام "تحریک ریشمی رومال اور سندھ" تجویز کیا ہے۔

یہ کتاب امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی کی عظیم الشان شخصیت اور ان کی قومی وملی خدمات کے اعتراف میں ایک نذر حقیر ہے۔ امید ہے کہ حضرت امام کے عقیدت مندوں میں اور قومی وملی تحریکات کے مطالعے کا ذوق رکھنے والوں میں پسند کی جائے گی۔ تاریخ سیاسیات پاک وہند کے طلبہ کے لیے بھی یہ کتاب کسی نہ کسی حد تک ضرور مفید ثابت ہوگی اور عام طور پر بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔

یکے از عقیدت مندان امام سندھی

ابوسلمان شاہ جہان پوری

۶۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے انقلابی منصوبے/ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری

اس کتاب کا نظر ثانی واضافہ وتصحیح شدہ ایڈیشن خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کا ایڈیشن ہے۔

۷۔ مولانا عبیداللہ سندھی کا انقلابی منصوبہ/ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

اس میں مولانا سندھی کے مشہور منصوبے، مطبوعہ ترکی ۱۹۲۴ء کے علاوہ چند دیگر مجوزہ سیاسی منصوبے اور بعض دیگر تاریخی سیاسی مضامین بھی شامل ہیں اور ان کے خاص منصوبے کا انگریزی متن بھی شامل ہے۔ اس کتاب پر خاکسار کا مقدمہ نظر ثانی واصلاح کے بعد زیر نظر تالیف میں ایک مستقل مقالے کی شکل میں شامل ہے۔ ذیل میں اس کا پیش لفظ درج کیا جاتا ہے:

پیشِ لفظ

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کا جو منصوبہ یہاں پیش کیا جاتا ہے وہ انھوں نے ۱۹۲۴ء میں ترکی سے شائع کیا تھا۔ اس کی تیاری میں ان کے شاگرد اور ساتھی ظفر حسن ایبک (ف: ۵؍جنوری ۱۹۸۹ء)

ان کے شریک تھے۔ یہ منصوبہ مختلف ذرائع سے ہندوستان بھیجا گیا تھا، لیکن برٹش گورنمنٹ نے ملک میں اس کے داخلے پر پابندی عاید کردی تھی، اس کے باوجود مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی کی نظر سے یہ منصوبہ گزرا تھا اور ردِعمل بھی سامنے آیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اسے مسائل کے پیشکش کی ایک عمدہ کوشش قرار دیا تھا۔ مولانا سندھی اس ردِعمل سے مطمئن تھے۔

۱۔ ایک گروہ وہ تھا جو فرقہ وارانہ اور ہندو مسلم اختلاف کو اہمیت ہی نہ دیتا تھا۔ اس کے نزدیک مسلمانوں کا یہ شور وشغب صرف انگریزوں کے ایما سے تھا اور ملک کی آزادی کی تحریک میں محض رکاوٹ کھڑی کرنے کے لیے تھا۔ اس کی کوئی واقعی حیثیت نہ تھی اور اس لیے نظر انداز کر دیے جانے کے قابل تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جس روز مسلمان یہ بھول جائیں گے کہ ان کے معتقدات، مذہب، تہذیب، تاریخ کا ہندوستان کے باہر کے کسی اور ملک سے کوئی تعلق ہے یا کسی دوسرے ملک کی کسی قوم سے کوئی فکری، اعتقادی اور تہذیبی رشتہ ہے اور اول وآخر وہ اپنے تئیں ہندوستانی سمجھنے لگیں گے، تمام اختلافات خود بہ خود مٹ جائیں گے۔ اس گروہ میں اکثر ہندو فرقہ پرست جماعتیں شامل تھیں۔ خود کانگریس میں شامل ایک مختصر جماعت کا بھی یہی خیال تھا۔

۲۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو ان اختلافات کو صرف عقائد ومذہب کے دائرے اور تہذیب وروایات میں محدود سمجھتا تھا اور دوسرے تمام سیاسی معاشرتی، اقتصادی عوامل کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے نظریے کے مطابق ملک کی تقسیم ہوتے ہی تمام مسائل یک لخت طے پا جائیں گے۔ یہ گروہ بس اللہ کے گنبد میں رہتا تھا اور عام طور پر مسلم لیگ سے وابستہ یا اس کے نقطۂ نظر کا حامل تھا۔ لیکن اس نے دیکھ لیا کہ اس کے نظریے کے مطابق انقلاب آنے کے باوجود ملک اور قوم کا ہر وہ مسئلہ جس کے حل کی اس نے آرزو کی تھی، نہ صرف اپنی جگہ پر ہے بلکہ اس نے اور زیادہ پیچیدہ شکل اختیار کر لی ہے۔

۳۔ ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اختلافات ونزاعات کا سبب صرف معاشی مسائل کو قرار دیتا تھا۔ آج ہندوستان پاکستان میں جو لوگ تقسیم ملک کے ساباب ومحرکات صرف معاشی قرار دیتے تھے، یہ اسی گروہ کے باقیات ہیں، یہ عام طور پر وہ لوگ تھے جو اپنے تئیں ترقی پسند کہلاتے ہوئے فخر کرتے تھے اور مذہب کی ضرورت کے عام طور پر قابل نہ تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب انتہا پسندانہ نظریات تھے۔ ہر دائرۂ فکر میں بعض بہت اہم مسائل کو

نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ ان میں اعتدال وتوازن اور جامعیت کے حامل نقطۂ نظر صرف مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے تھے۔ وہ اختلافات اور تنازعات کے ہر سیاسی، مذہبی وتہذیبی، معاشی سبب اور محرک کو اس کی قرار واقعی جگہ دے کر اختلافات کا حل تلاش کرتے تھے۔ مولانا سندھی مرحوم نے اپنے افکار کو ایک جامع پروگرام کی شکل میں مرتب کر دیا تھا، جب کہ مولانا آزاد کے افکار کو کانگریس کے سنجیدہ معتدل اور حقیقت پسند وبالغ نظر ارکان کے مساعی اور رویوں میں تلاش کرنا چاہیے۔

مولانا عبیداللہ سندھی کے اس منصوبے کی اشاعت سے پہلے بھی اور بعد میں بھی سیاست دانوں، اہلِ علم، اصحابِ نظر اور سرکاری وغیر سرکاری حلقوں اور مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی طرف سے دو چار دس پانچ نہیں بہت سی اسکیمیں پیش کی گئی جن کی تعداد سو تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن ان میں سے بیشتر ناقص اور کم فہمی اور عدمِ بصیرت پر مبنی تھیں۔ اس لیے شمار میں آجانے کے باوجود وہ اصحابِ علم وتدبر کی توجہ حاصل نہیں کر سکیں۔

فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لیے جو تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو انہی دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۲۔ دوسری قسم ان تجاویز کی تھی جن میں برصغیر کی دو اکثریتوں، ہندو اور مسلمانوں میں ملک کو تقسیم کر دیے جانے کا مشورہ دیا گیا تھا۔

اگر نوع کے اعتبار سے مولانا سندھی کے منصوبے کو دیکھا جائے تو اس میں ملک کے اتحاد کو برقرار رکھا گیا تھا۔ تقسیم کے تمام منصوبوں میں مولانا سندھی کی اسکیم سب سے زیادہ جامع تھی۔ اس میں نہ صرف ملک کی دو اکثریتوں کے چھوٹے سے چھوٹے مسئلے کو نظر انداز نہیں کیا گیا تھا بلکہ ملک کی چھوٹی سے چھوٹی اقلیت کے مسائل کا حل اور اس کے اطمینان کا سروسامان کیا گیا تھا۔

— فرقہ وارانہ مسائل میں مذہبی، تہذیبی، تعلیمی مسائل تھے۔

— طبقہ وارانہ مسائل میں کسان، مزدور، تاجر، ملازم پیشہ، زمین دار کے مسائل تھے۔

— علاقائی مسائل میں علاقوں، صوبوں اور ریاستوں کے مسائل شامل تھے۔

اس کے علاوہ مذہب، زبان، رسم الخط، تہذیب، معاش اور روزگار، تعلیم، صحت وغیرہ کے عام مسائل، جنھیں حل کرنا ہر ملک کی حکومت کے اہم فرائض ہوتے ہیں، شامل تھے۔ براعظم ہند پاکستان

کے خاص جغرافیائی حالات اور مختلف صوبوں، علاقوں اور ریاستوں میں مختلف اقوام کی کم وبیش آبادی اور مذاہب وفرق کی کثرت وافکار وعقائد کے اختلافات نے زندگی کے ہر شعبے میں مسائل کے حل میں جو پیچیدگیاں پیدا کردی تھیں اور پورے ملک کے لیے ایک انتظامیہ اور ایک تعلیمی، عدالتی نظام کے نفاذ اور یکساں اصول کے تحت قانون سازی کی مشکلات، مذہبی تعلیمی کے مسائل، تہذیبوں اور ثقافتوں کے تحفظ وترقیات وغیرہ کے بے شمار مسائل تھے، جن کا سنجیدہ وحقیقت پسندانہ حل پیش کیا گیا تھا۔

مولانا سندھی نے اپنی اسکیم میں نہ صرف ملک کے ہمہ قسم کے اور چھوٹے بڑے مسائل کا حل پیش کیا تھا۔ بلکہ ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں وغیرہ کے قومی خصائص وامتیازات نے ان میں ایک دوسرے پر برتری اور تفوق کے جذبات واحساسات اور عصبیتوں کو جو پختہ کردیا تھا، اسکیم میں ان تک کا لحاظ رکھا گیا تھا۔

آج ہم یہ بات بالیقین نہیں کہہ سکتے کہ اگر یہی اسکیم برصغیر کے سیاسی مسئلے کے حل کے طور پر اختیار کرلی جاتی تو اس کی عملی افادیت کیا ہوتی اور اس سے ملک کے مسائل کس حد تک حل ہوتے، لیکن ہم جب ایک اسکیم کے عمل میں آنے کے بعد برصغیر پاک وہند میں مسائل کا ہجوم دیکھتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اس اسکیم میں نقص تھا اور ان کے بنانے والوں کو ملک کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسائل اور ان کے تمام پہلوؤں اور اس کے نتیجے میں آئندہ پیش آنے والے حالات ومسائل کا شاید کامل شعور نہ تھا۔ اس کے ساتھ مولانا سندھی کی اسکیم کی جامعیت، اس کی منطق اور استدلال کی قوت دل کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے اور اس کی افادیت ومعنویت ذہن پر نقش ہوجاتی ہے۔

یہاں تک لکھ لیا تو مجھے خیال آیا کہ حضرت مولانا سندھی کی اسکیم کا کسی اور اسکیم سے موازنہ ہی نہ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ مولانا سندھی کی اسکیم ایک جامع الاطراف اسکیم تھی۔ اس کے مقابلے میں کوئی دوسری اسکیم تھی ہی نہیں۔

ا۔ علامہ اقبال مرحوم نے دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے خطبہ الہ آباد میں جو کچھ کہا تھا، وہ ایک مجمل تصور کے اظہار سے زیادہ نہ تھا۔ پھر یہ کہ اس کی تعبیر وتشریح پر بھی تمام اصحاب فکر ودانش متفق نہیں!

۲۔ مسلم لیگ کی قرارداد لاہور (۱۹۴۰ء) جسے بعد میں قرارداد پاکستان کا نام دیا گیا۔ وہ محض ایک قرارداد اور اسکیم کی خوبیوں کی تمام تفصیلات اور خصوصیات سے عاری ہے۔ حتیٰ کہ اس کے متن کی

صحت پر بھی سب کا اتفاق نہیں، اس کا تحریر و تالیف کنندہ ابھی تک پردہ خفا میں ہے۔ اس کے مطالب کے نقائص بھی زیر بحث آئے ہیں اور بعض دوسری خرابیوں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ اس لیے حضرت علامہ اقبال کے تصور اور مسلم لیگ کی ناقص قرارداد سے مولانا سندھی کی جامع اسکیم کا موازنہ اصولاً غلط ہے۔ اگر اس کے مقابلے میں کوئی اسکیم لائی جاسکتی ہے، جس میں اس کے تمام مسائل کا کامل طور پر جائزہ لیا گیا تھا اور ہر مسئلے کے حل کے لیے دوٹوک الفاظ میں فیصلہ کر دیا گیا تھا تو وہ صرف ''نہرو رپورٹ تھی، لیکن وہ بھی روبہ عمل نہ آسکی۔ فرقہ ورانہ مسئلے کے حل میں اس کے قرارداد اصولوں سے عدم اطمینان اور ایک خاص سیاسی ذوق رکھنے والوں کو غوغا آرائی کے باوجود پاس ہو جانے کے بعد حکومت نے اس کے قبول کرنے سے پہلوتہی کی۔ جس کے نتیجے میں کانگریس کو سول نافرمانی کی تحریک چلانی پڑی تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ جب بھی کسی پروگرام اور نظام کو جو صرف عمل و نفاذ کے لیے ہو، اگر منطق اور کلام کے حوالے کر دیا جائے تو عام طور پر نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ جو مشکلات خاص عمل کی ہوتی ہیں، ان کا حل موقع ہی پر تلاش کرنا چاہیے۔ اس کے حل میں منطق ہرگز سودمند نہیں ہوتی۔ نہرو رپورٹ تو بہ ہر حال ایک چیلنج کا جواب تھا اور اگر چیلنج دینے والے کی نیست و خواہش کو دیکھنا ضروری ہو تو یقین رکھنا چاہیے کہ نہرو رپورٹ کا یہی انجام ہونا تھا۔

خواہ نہرو رپورٹ آزاد ہندوستان کے نظام سیاسی اور اقلیتوں کے حقوق کا اطمینان بخش اور کافی حل نہ ہو تب بھی اس میں شبہ نہیں کہ وہ مسائل کے تصفیے کی ایک پختہ بنیاد ضرور ثابت ہوسکتی تھی۔ اس میں ملک کے ہمہ قسم کے مسائل کا جامع الاطراف جائزہ لیا گیا تھا۔ اس لیے مولانا سندھی کے پروگرام سے اس کا موازنہ کرنا غلط نہیں ہوسکتا۔ دونوں اسکیموں کا تقابلی مطالعہ ایک عمدہ اور دلچسپ موضوع ہے۔ لیکن اس بات کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے کہ نہرو رپورٹ ملک کے منتخب اعلیٰ دماغوں کے غور و فکر کا حاصل تھا اور مولانا سندھی کی اسکیم صرف ایک تنہا شخص کی دماغی اور فکری کاوش کا نتیجہ تھی۔ وہ تنہا شخص مولانا عبید اللہ سندھی تھے۔ اس کی تالیف و ترتیب میں ان کے ساتھ ان کے ساتھی اور شاگرد ظفر حسن شامل تھے، ان کے اخلاص میں کوئی شبہ نہیں لیکن مولانا کے فکر کی بلندی، ذہن کی رسائی اور علمی مرتبے میں تو وہ اس کے ۶۴ برس ۳ ماہ اور ۲۰ دن بعد اپنی وفات تک) بھی نہ پہنچ سکے تھے۔ اس لیے ان دونوں کے موازنے میں اہلِ علم کی ایک جماعت کے غور و فکر کے حاصل اور ایک تنہا شخص کی دماغی کاوش کے فرق کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے۔

بلا شبہ مولانا عبیداللہ سندھی کی اسکیم بہت جامع ہے۔ وہ ان کے افکار کے نظام سیاسی یا ملک کے آئندہ سیاسی انتظامی ڈھانچے کا فقط ایک قابلِ عمل اور عمدہ نمونہ ہے۔ لیکن کسی ملک کی تعمیر و ترقی، فلاح و بہبود، انتظام و انصرام تعلیم و تربیت، امن و امان اور دفاع ملک و قوم کے تمام کام مجرد ایک سیاسی انتظامی ڈھانچے کے بن جانے ہی سے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ جاتے۔ اس لیے متعدد اور اسکیموں، منصوبوں، تنظیموں، مختلف قسم کے اداروں کی تشکیل اور ان کے لیے نصب العین کا تعین، لائحہ عمل اور طریقہ کار کی تیاری اور بہترین نتائج کے حصول کے لیے پروگرام بنانے کی ضرورت ہوتی ہے اور برصغیر ہند پاکستان جیسی کثیر المذاہب اور مختلف النوع اقوام کی سرزمین میں یہ مسائل اور زیادہ پیچیدہ شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مولانا سندھی مرحوم کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف ملک کے سیاسی نظام اور دستوری مسائل کے بارے میں ایک جامع اسکیم پیش کی بلکہ دوسرے ہر قسم کے مسائل اور ان کے تمام پہلوؤں پر بھی نظر ڈالی اور ہر ایک ضرورت کے بارے میں کوئی تنظیم، کوئی پارٹی یا کوئی ادارہ تشکیل دے کر اس کے مقاصد، قواعد وضوابط اور لائحہ عمل تک بنا کر ملک و قوم کے لیے رہ نمائی مہیا کر دی ہے۔ ان کی مہابھارت سرو راجیہ پارٹی اور دوسری اسکیموں اور تنظیموں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں، تو یہ سب ہمیں ایک بڑے نظام فکر سے مربوط معلوم ہوتی ہیں۔

تعجب اور حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ یہ سب اسکیمیں اور تنظیمیں مولانا سندھی کے اعلیٰ دماغ کی تخلیق اور ان کے نکتہ رس ذہن کی پیداوار تھیں۔ یہ ان کی ذہانت اور فطانت کے ثبوت ہیں، جن کا مطالعہ ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہمارے سامنے مختلف پارٹیوں، کئی مشنوں، اہل تدبر کے مجموعوں کے غور وفکر اور بحث ونظر کے بعد منظور کردہ تجاویز ہیں لیکن حیرت ہوتی ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک تنہا شخص کی بنائی ہوئی ایک اسکیم کی خوبیوں کا عشر عشیر کے درجے میں بھی مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

مولانا سندھی مرحوم کی یہ اسکیمیں جن کی طرف اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا گیا ہے اور جو ایک ہی جامع نظام فکر کے ضروری اور اہم اجزا ہیں۔ ان میں سب سے پہلے تو مولانا سندھی کا یہی کل ہند سرو راجیہ پروگرام ہے جو یہاں ایک تاریخی اور انقلابی منصوبے کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ آزاد ہندوستان کے لیے ایک بہت جامع اور مکمل دستور کا ڈھانچا تھا۔ دوسری تنظیمیں اور اسکیمیں یہ ہیں؛

۲-سندھ ساگر پارٹی کے اصول اور پروگرام کا مسودہ۔ ۳-جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی۔ ۴-

جمعیت خدام الحکمۃ۔۵-سندھ ساگر نیشنل بورڈ۔۶-اسی سلسلے میں مولانا سندھی کی ایک تحریر ''ہم کیا چاہتے ہیں؟'' کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا۔۷-ان کے علاوہ چند اور مسائل ومباحث ہیں، ان میں سے ایک مسئلہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے بارے میں یہ بحث ہے کہ آیا یہ تنظیم نیشنل (قومی) ہے یا انٹر نیشنل (بین الاقوامی)؟ یہاں اقوام سے مراد ہندوستان میں بسنے والی اقوام ہی ہیں نہ کہ سرزمین عالم پر پھیلی ہوئی اقوام و مذاہب۔ مولانا سندھی کے لیے یہ بحث نہایت ضروری تھی۔ کانگریس کے ساتھ ''نیشنل'' کا لفظ یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ یہ کسی ایک قوم کی جماعت ہے یا کانگریس ہندوستان میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی کے عقائد و مذہب کے امتیازات کو مٹا کر ایک نیشن یا ایک قوم بنانے کا عقیدہ رکھتی ہے اور اس عقیدے پر ہندوستان کی تمام قوموں اور اہلِ مذاہب کو جمع کرنا چاہتی ہے۔

مسلم لیگ کے پروپیگنڈے نے کم ازکم مسلمانوں کے دلوں میں اس خیال کو پختہ کر دیا تھا، لیکن کانگریس کے مقاصد میں مختلف تہذیبوں اور مذہبوں کے اختلافات اور امتیازات کو مٹا کر ایک نیشن یا ایک قوم بنانے کا کوئی تصور نہ تھا۔ کانگریس صرف یہ چاہتی تھی کہ ملک کو انگریزی سامراج سے نجات دلانے، ملک کی تعمیر و ترقی اور عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں میں کوئی مذہب اور عقیدہ رکاوٹ نہ بنے، ہندو ہندو رہ کر اور مسلمان مسلمان کی حیثیت میں ملک کی تحریک آزادی میں، ملک کی ترقی کے کاموں میں، عوام کی فلاح اور ملک کی دفاع کے مقصد سے ایک نیشن اور ایک قوم بن جائیں۔ کانگریس آزادی کے بعد بھی اپنے اس نصب العین سے نہیں ہٹی۔ ہندوستان کے دستور میں تمام مذاہب کا یکساں احترام اور سب کو یکساں آزادی اور ملک کے سیاسی نظام، ملک کی ترقی اور دفاع کے کاموں میں سیکولر اصول کا اختیار کرنا، اس کے اسی نصب العین پر پختہ اعتقاد کا غماز ہے۔ کانگریس نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ اپنے تئیں اس نصب العین سے نہ ہٹی بلکہ کل ہند اقوام اور سیاسی تنظیمات کو بھی اسی اصول پر لا جمع کیا۔ آج اگر ہندوستان کی اقوام اور وہاں کی سیاسی پارٹیوں کے اختلافات و شکایات اور سوسائٹی کی بے شمار خرابیوں کو نظر انداز کر دیا جائے، جو ہر معاشرے اور سوسائٹی میں ہوتی ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی پالیسی میں سیکولر اصول ہندوستان کی تمام اقوام، تمام سیاسی پارٹیوں کا اور تمام اہلِ مذاہب کا قومی سیاسی متفقہ اصول ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے اس مضمون میں یہ مسئلہ نہایت خوش اسلوبی سے سلجھا دیا ہے اگر

حسن خطابت کو نظر انداز کر دیا جائے تو مولانا سندھی کا یہ مضمون سیاسی لٹریچر میں بہت اہمیت کا حامل ہے، اور مولانا ابوالکلام آزاد کے خطبہ رام گڑھ کانگریس (۱۹۴۹ء) کے بعض اہم اور دلکش مطالب سے کسی طرح کم نہیں۔

اسی سلسلے کا ایک خطبہ صدارت ہے جو مولانا سندھی نے جمعیۃ علمائے سندھ کے اجلاس (اپریل ۱۹۴۴ء) کے لیے لکھا تھا لیکن بعد میں مولانا کی صحت کی خرابی کی وجہ سے انھی کے ایما سے مولانا قاری محمد طیب دیو بندیؒ کو اس کا صدر بنایا گیا تھا۔ یہ خطبہ ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوا ہے۔ مولانا نے اس میں ملک کے اجتماعی مفاد خصوصاً مسلمانوں کے نقطہ نظر سے بہت اہم نکات اٹھائے ہیں اور ان پر بحث کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا سندھی کے فلسفہ سیاسی اور اس کے نظام کو سمجھنے میں یہ خطبہ بہت مفید ہے۔ اس لیے اسے بھی مولانا کی سرور اجی اسکیم کے ساتھ شامل کر لیا ہے۔

یہ تمام جماعتیں اور تنظیمیں ایک ہی نظام فکر سے تعلق رکھتی ہیں اور مولانا سندھی کی مہا بھارت سروراجیہ پارٹی کے پروگرام اور ان کے پیش کردہ حکومت متوافق سروراجیہ جمہوریات ہند یا انڈین فیڈرل سروراجیہ ری پبلکن اسٹیٹس کے نظم کو سمجھنے کے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتی ہیں، جتنی کسی انسانی جسم اور اس کی شکل کو سمجھنے کے لیے جسم کے اعضا و جوارح کے ادراک و مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ملک کے ارباب بصیرت اور اصحابِ فکر و تدبر کو مولانا عبید اللہ سندھی کی ان اسکیموں اور ان کے افکار و افادات سیاسیہ پر غور کرنا چاہیے اور اگر ان سے موجودہ حالات میں کوئی بھی رہنمائی ملتی ہے تو اس سے فائدہ اٹھانے میں ہرگز دریغ نہ کرنا چاہیے۔

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کا یہ منصوبہ سب سے پہلے ۱۹۲۴ء میں ترکی سے شائع ہوا تھا۔ پھر اسے تیس برس بعد ۱۹۵۴ء میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی نے اپنے رسالے تاریخ و سیاسیات میں شائع کیا تھا۔ اب اس کی اولین اشاعت کے ستر برس بعد خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے اسے شائع کرنے کا عزم کیا ہے۔ اس کے لیے میں ارباب اختیار کا شکر گزار ہوں۔

منصوبے کی اس اشاعت میں اس سلسلے کی بعض توضیحات و تشریحات کے ساتھ کئی دوسری اہم مطبوعہ و غیر مطبوعہ اسکیمیں بھی شامل کر دی ہیں جو مولانا سندھی کے قلم سے یادگار تھیں اور منصوبے کے ہمہ جہت مطالعے میں ان کی اہمیت مسلم تھی۔ اس اہتمام نے سابقہ دونوں اشاعتوں کے مقابلے میں

اس اشاعت کی اہمیت بہت بڑھادی ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس منصوبے اور اس کے ساتھ دیگر متعلقہ اسکیموں کی اشاعت سے برصغیر ہند پاکستان کی سیاسی تاریخ کے مطالعے کا ایک نیا باب کھلے گا جس کا کھلنا علمی سیاسی افادیت سے ہرگز خالی نہ ہوگا۔

ابوسلمان

۹/جون ۱۹۹۴ء

ڈاکٹر محمد ارشد *

متکلم شبلی

علم کلام مسلمانوں کے ساتھ خاص ہے۔ اس کا مقصد ایک ایسا علمی وفکری ماحول تیار کرنا ہے جس میں اسلام کی ازلی وابدی صداقتوں کی اہمیت اور عظمت کو تسلیم کیا گیا ہو۔ عباسی عہد میں اپنے آغاز سے لے کر آج تک مسلم مفکرین اور دانشور اس طرح کی علمی فضا تیار کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ دور اول سے ہی مسلمانوں نے اس علم کے ذریعے سے عقائد اسلامی کے باب میں اسلامی تعلیمات کی عظمت کو بحال کیا اور مخالفین کی جانب سے اس پر وارد ہونے والے اعتراضات کے مسکت جواب دیے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی اہمیت اور افادیت کو لے کر ہمیشہ سے مسلمانوں میں دو رائیں رہی ہیں۔ مسلم علما کا ایک طبقہ اثبات عقائد اور شکوک وشبہات واعتراضات کے ازالے کے لیے علم کلام کو از حد ضروری خیال کرتا ہے، جب کہ علمائے اسلام کا ایک دوسرا طبقہ اس خیال کا حامل ہے کہ اس سے شکوک وشبہات اور اعتراضات کا ازالہ تو نہیں ہوتا ہاں ذہنی ورزش ضرور ہو جاتی ہے، اس کے نزدیک عقیدے کا تعلق دماغ سے نہیں دل سے ہوتا ہے۔ کلامی بحثوں سے دلیل وحجت تو قائم کی جا سکتی ہے، قلبی ایمان وایقان حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ امام غزالی ورازی سے لے کر شبلی تک متعدد متکلمین اسلام کے اعترافات بھی اس حوالے سے موجود ہیں۔[1] اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اسلام پر

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵ ای میل: marshad@jmi.ac.in

وارد ہونے والے شکوک وشبہات اور اعتراضات کے ازالے کے لیے قدیم زمانے سے لے کر آج تک ہر دور میں علم کلام کا استعمال ہوتا رہا ہے اور اس کی ضرورت کو بھی محسوس کیا جاتا رہا ہے۔ اسی طرح مختلف زمانوں میں علم کلام کے مباحث بھی بدلتے رہے ہیں۔ دور اول میں فلسفے سے متعلق مباحث کا غلبہ رہا اور عقائد اسلام پر بے باکی کے ساتھ سوالات اٹھائے گئے، تو موجودہ دور میں اسلامی تاریخ اور شخصیات کو نشانہ بنایا گیا، اخلاقی، قانونی اور تمدنی مسائل زیر بحث آئے۔ البتہ یہ حقیقت بھی ہمیشہ نظر میں رہنی چاہیے کہ مباحث بدلنے سے اصول نہیں بدل جاتے۔ علم کلام کے مباحث بدلے ہیں، اصول وہی پرانے ہیں۔

اردو نسبتاً جدید زبان ہے، اس لیے دیگر کئی علوم کی طرح علم کلام، خصوصا اس کی تاریخ کا، سرمایہ بھی اس زبان میں کم ہے۔ سرسید احمد خاں اردو زبان کے شاید پہلے متکلم ہیں اور شبلی متکلم ہونے کے ساتھ علم کلام کے پہلے مورخ بھی۔ بلکہ شبلی کے دعوے کو اگر درست مان لیا جائے تو ان سے پہلے اردو ہی کیا عربی اور فارسی میں بھی علم کلام کی کوئی مبسوط تاریخ نہیں لکھی گئی۔[۲] اس مقالے میں شبلی کی متکلمانہ حیثیت پر گفتگو کی گئی ہے۔

علامہ شبلی کا شمار عبقریات زمانہ میں ہوتا ہے۔ ان کی ذات میں امکانات کے اتنے پہلو جمع ہو گئے تھے کہ عمر اگر وفا کرتی تو ان کی علمی یافت اس سے بہت زیادہ ہوتی جو آج ہمارے سامنے ہے۔ ۵۷ برس کی عمر میں اور خاص طور پر زندگی کے آخری تیس برسوں میں، جب سے وہ سرسید کے زیر اثر آئے، شبلی نے مختلف الجہات کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس دوران ان کی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع رہا کہ ان تک رسائی کے لیے بالعموم ادارے درکار ہوتے ہیں۔ تاریخ وادب کے شہسوار تو وہ تھے ہی، مذہب و سیاست پر بھی ان کی گرفت زبردست تھی۔ وہ ماہر تعلیم بھی تھے، مربی اور مرشد بھی۔ بلاشبہ ان میدانوں میں ان کی خدمات اور کارناموں کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے۔ البتہ ان کی شخصیت کے بعض پہلو ایسے بھی ہیں جو 'بوجوہ' یا تو سامنے نہیں آئے یا ان کا کماحقہ اعتراف نہیں کیا گیا۔ ان کی متکلمانہ حیثیت کا شمار ایسے ہی فراموش کردہ پہلوؤں میں ہوتا ہے۔

شبلی کی شخصیت کا ایک اہم پہلو علم کلام میں ان کی خدمات ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے شاگرد رشید اور کسی حد تک ان کے علمی جانشین سید سلیمان ندوی نے انھیں 'عہد جدید کا معلم اول' قرار دے کر شبلی کی متکلمانہ حیثیت کو بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔[۳] پروفیسر خورشید الاسلام کے مطابق

'شبلی پہلے یونانی ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے'۔[۴] اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے مطابق 'مولانا متکلم سب سے پہلے تھے'۔ لکھتے ہیں:

''مذہبیت مولانا کی تصنیفی زندگی پر چھائی ہوئی تھی۔ شعر ہو، ادب ہو، تاریخ ہو، سوانح عمری ہو، کچھ ہو، مولانا متکلم سب سے پہلے تھے اور کچھ اور بعد کو۔ شعر العجم ایک خالص علمی ادبی کتاب ہے، ظاہر ہے شعر عجم کی اس تاریخ وتبصرہ کو مذہب سے کیا واسطہ؟ لیکن نہیں، ذرا ملاحظہ ہو کہ گریز سے قبل اس قصیدہ ضخیم کو تشبیب میں مولانا کا قلم کس رنگ کا موتی پروتا ہے:

'اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپے پر برسا۔ لیکن فیض بقدر استعداد پہنچا۔ جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی اسلام نے اس کو اور چمکایا۔ ترک شجاع تھے، شجاع تر ہو گئے۔ ایرانی ہمیشہ سے تہذیب، معاشرت اور علوم وفنون میں ممتاز تھے، اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا۔ [۵]

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس کے باوجود شبلی کی متکلمانہ حیثیت کو تسلیم کیوں نہیں کیا گیا، وہ اس طور پر فراموش کیوں کیے جاتے رہے اور آج تک اس پر پردہ کیوں پڑا ہوا ہے؟ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کی متکلمانہ شخصیت اس لیے پردے کے پیچھے چلی گئی کہ ان کے بعد جن لوگوں نے شبلی کی علمی روایت کو آگے بڑھانے کا کام کیا انھیں علم کلام سے کوئی خاص شغف نہیں تھا۔ ایک اور وجہ جس کی طرف اشارہ پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے اپنی کتاب 'شبلی کی علمی وادبی خدمات' میں کیا ہے وہ یہ ہے کہ شبلی کی متکلمانہ حیثیت کے اعتراف واظہار میں شاید سب سے بڑی رکاوٹ ان کے شاگرد خاص سید سلیمان ندوی کا علم کلام کے تئیں رویہ ہے۔ علم کلام کے تعلق سے وہ اپنے استاد کے نظریے سے نہ صرف یہ کہ اتفاق نہیں رکھتے بلکہ ان کے نزدیک علم کلام کی افادیت ہی مشکوک ہے، [۶] جس کے تحت وہ شبلی کی تمام تر کلامی خدمات کی عمارت کو یہ کہہ کر منہدم کر دیتے ہیں کہ 'جدید علوم ومسائل سے ان کی واقفیت بھی ''محض سنی سنائی'' ہی تھی یا ''ثانوی درجے'' کی تھی'۔ لکھتے ہیں:

> ''اسی خیال کے بہ موجب انہوں نے خود سبقت کی اور اپنے بل بوتے کے مطابق قدیم علم کلام میں سے جدید علم کلام کے عناصر جمع کیے اور الغزالی، سوانح مولانائے روم، علم کلام اور الکلام میں ان کو ترتیب دیا۔ مگر ان کتابوں میں دو قسم کی کمیاں محسوس ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ جدید علوم ومسائل سے ان کی

واقفیت بھی محض سنی سنائی ہی تھی، یا ثانوی درجے کی تھی، اس لیے وہ ان مقامات کی پوری تحدید نہ کر سکے جہاں سے اسلامی مسائل پر زد پڑتی تھی۔ دوسری کمی یہ ہوئی کہ اسلام کے صحیح عقائد کو متکلمین وحکمائے اسلام کی کتابوں سے چن کر یکجا کیا، حالانکہ ان کا اصلی سرچشمہ کتاب الٰہی اور سنت نبوی تھی۔ اگر یہ دونوں چیزیں براہ راست سامنے رکھی جاتیں تو منزل مقصود کا صحیح پتہ لگ جاتا، اخیر زمانہ میں علامہ ابن تیمیہ کی تصنیفات کے مطالعے نے یہ نقطہ نظر ان کے سامنے کر دیا تھا، مگر تصنیفی عمل کا وقت گزر چکا تھا۔ البتہ سیرت نبوی کی تکمیل کا موقع ان کو ملتا تو ضرور وہ اس کی تلافی کرتے۔'' [۷]

سید صاحب نے اپنے دعوے کی کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے۔ البتہ یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ 'محض سنی سنائی' اور 'ثانوی درجے کی' معلومات پر مبنی شبلی نے اردو زبان میں علم کلام کی تاریخ اور قدیم و جدید علم کلام کا جو سرمایہ فراہم کر دیا ہے شبلی کے گزر جانے کے سو برس بعد بھی اس ذخیرے میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا ہے۔ شبلی نے جن کلامی مباحث پر علم الکلام میں گفتگو کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ ان کے زمانے میں تازہ اور برمحل تھے بلکہ ان کی معنویت آج بھی بڑی حد تک باقی و برقرار ہے۔ رہی بات شبلی کے سنی سنائی باتوں اور ثانوی درجے کی معلومات پر اعتماد کی تو شبلی کے ایک واقف کار اس حوالے سے لکھتے ہیں، حالاں کہ اس کا پس منظر تصوف کا مضمون ہے:

''سوانح (مولانا روم) میں شبلی نے تصوف کے متعلق جو بحث کی ہے وہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے مکتوب ششم سے ماخوذ ہے، جس کا اعتراف خود شبلی نے کیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں شبلی ذاتی واقفیت نہیں رکھتے تو سنی سنائی باتوں کو بیان کرنے کے مقابلے خاموش رہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔'' [۸]

شبلی کی عمومی شہرت تاریخ وادب کے ماہر کی ہے۔ انھوں نے تاریخ کو علم کلام کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے بلکہ ریاض الرحمان خاں شیروانی کے الفاظ میں تاریخ اور علم کلام کو باہم پیوست کر دیا ہے۔ [۹] اور بقول پروفیسر ظفر احمد صدیقی:

''واقعہ یہ ہے کہ ان کی اصل جولاں گاہ 'تاریخ' نہیں 'علم کلام' ہے اور وہ مورخ سے زیادہ متکلم ہیں، لیکن بظاہر ان کی مورخانہ شخصیت ان کی متکلمانہ شخصیت پر اس لیے حاوی نظر آتی ہے کہ ان کی بیشتر تصانیف اور مقالات تاریخی یا نیم تاریخی ہیں یا ان کا مواد تاریخ سے ماخوذ ہے۔ حالاں کہ نکتے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے ہر جگہ نہایت چابک دستی کے ساتھ تاریخ کو علم کلام کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔''[۱۰]

واقعہ یہی ہے کہ شبلی کی متکلمانہ حیثیت کو کما حقہ تسلیم نہیں کیا گیا جب کہ بقول پروفیسر ظفر احمد صدیقی:

''مولانا شبلی اپنے مراجع و مآخذ کے لحاظ سے مورخ اور اسلوب وطرز ادا کے لحاظ سے انشا پرداز یقیناً قرار دیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اگر اغراض و مقاصد پر نظر کی جائے تو اس پہلو سے وہ ایک زبردست متکلم تھے۔ اس لیے یہ دعوی غلط نہیں کہ مولانا کی متکلمانہ حیثیت کو ان کی دوسری حیثیتوں پر ترجیح حاصل ہے۔''[۱۱]

شبلی کے بارے میں سید سلیمان ندوی کے اس دعوے پر کہ وہ عہد جدید کے معلم اول تھے، گفتگو کی جاسکتی ہے کیوں کہ علماء کا ایک بڑا طبقہ ہے جو سرسید کے علم کلام سے اختلاف کے باوجود برصغیر میں انھیں جدید علم کلام کا بانی باور کرتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ عہد جدید میں حالات وضروریات زمانہ کے مطابق اسلام کو درپیش چیلنجز کا سامنا کرنے اور نئے قائم ہونے والے سوالوں کا جواب اسی انداز میں دینے کی کوشش سرسید نے ہی سب سے پہلے کی۔ اس حوالے سے ان کی کتاب خطبات احمدیہ کو مقام اولیت بہرحال حاصل ہے۔ ریاض الرحمان خاں شیروانی نے شبلی صدی تقریبات کے موقعے پر اپنے کلیدی خطبے میں لکھا ہے:

''علامہ شبلی سے الغزالی کے لکھنے کی فرمایش سب سے پہلے سرسید احمد خاں نے کی تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے یہ فرمایش کیوں کی تھی؟ ہمارا خیال ہے کہ اس کا سبب خود سرسید کا علم کلام سے ذوق ہوسکتا ہے۔ اگر ان کی پوری مذہبی فکر کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ خود بھی متکلم ہی تھے۔ علم کلام ہے کیا؟ اسلامی فکر اور اپنے دور کی راجح فکر میں مطابقت پیدا کرنے کی

کوشش۔ امام غزالی کا واسطہ یونانی فلسفے سے رہا تھا اور سرسید اور علامہ شبلی کا
مغربی سائنس سے۔ اس لیے ان سب نے اپنے اپنے دور میں اپنے اپنے طور
پر فلسفہ، سائنس اور مذہب میں رشتے تلاش کرنے کی کوشش کی۔'' [۱۲]

شبلی علم کلام کے مورخ بھی ہیں اور جدید علم کلام کے مدون بھی۔ انھوں نے علم کلام کی دو قسمیں بیان کی ہیں: ایک کا تعلق اسلامی فرقوں کے باہمی تنازعات سے ہے اور دوسری قسم فلسفے کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے ایجاد ہوئی۔ [۱۳] اعتقادی مباحث کو شبلی مقتضائے وقت نہیں سمجھتے البتہ تاریخ علم کلام لکھتے ہوئے عقائد کی مذہبی بحثوں کا تعارف ضرور کراتے ہیں۔ ان کا اصل زور دوسری قسم کے علم کلام پر ہے، جسے وہ 'علم کلام عقلی' کہتے ہیں اور جو فلسفے کے مقابلے کے لیے ایجاد ہوا۔ [۱۴] شبلی نے اسی دوسری قسم کے علم کلام کی تاریخ لکھی ہے اور اسی کے نمونے پر جدید علم کلام مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک علم کلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو یونانیوں کی فکری غلامی سے آزادی دی۔ [۱۵] شبلی کا تعلق جس عہد سے ہے اس میں مسلمانوں کے اندر ایک نئی فکری غلامی (جدید یورپی [مغربی] افکار سے مرعوبیت) فروغ پا رہی تھی۔ یقیناً شبلی جدید علم کلام کے ذریعے مسلمانوں کو اس نئی فکری غلامی سے آزادی دلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''علم کلام جو مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ایک مہتم بالشان علم اور
ان کا سرمایہ ناز ہے، میں آج کل اس کی نہایت مبسوط تاریخ لکھ رہا ہوں
اور اس کے چار حصے قرار دیے ہیں: (۱) علم کلام کی ابتدا، اس کی مختلف
شاخیں، عہد بہ عہد تبدیلیاں اور ترقیاں (۲) علم کلام نے اثبات عقائد
اور ابطال فلسفہ کے متعلق کیا کیا؟ اور کس حد تک کامیابی حاصل کی؟
(۳) ائمہ علم کلام کی سوانح عمریاں (۴) جدید علم کلام'' [۱۶]

شبلی نے علم کلام کی تاریخ لکھنے کے ساتھ جو نیا علم کلام مرتب کیا اس کا ماخذ ابومسلم اصفہانی، قفال، ابن حزم، امام غزالی، راغب اصفہانی، ابن رشد، امام رازی اور شاہ ولی اللہ کی تحریروں کو بنایا۔ [۱۷] شبلی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ کی طرح علم کلام کو بھی زمانے کے مذاق اور ضروریات کے مطابق مرتب کیا۔ لکھتے ہیں:

''قدیم علم کلام میں صرف عقائد اسلام کے متعلق بحث ہوتی تھی۔ کیوں کہ

اس زمانے میں مخالفین نے اسلام پر جو اعتراضات کیے تھے، عقائد ہی کے متعلق تھے۔ لیکن آج کل تاریخی، اخلاقی، تمدنی ہر حیثیت سے مذہب کو جانچا جاتا ہے، یورپ کے نزدیک، کسی مذہب کے عقائد اس قدر قابل اعتراض نہیں جس قدر اس کے قانونی اور اخلاقی مسائل ہیں۔ ان کے نزدیک تعدد نکاح، طلاق، غلامی، جہاد کا کسی مذہب میں جائز ہونا، اس مذہب کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس بنا پر علم کلام میں اس قسم کے مسائل سے بھی بحث کرنی ہوگی اور یہ حصہ بالکل نیا علم کلام ہوگا''۔[۱۸]

شبلی نے تعدد ازدواج، طلاق، غلامی اور جہاد جیسے موضوعات پر تو نہیں لکھا اور ایسا شاید اس لیے کیا ہو کہ ان سے پہلے سرسید اور ان کے بعض رفقاء، خاص طور پر مولانا چراغ علی ان موضوعات پر لکھ چکے تھے۔ البتہ انھوں نے الکلام میں انسانی حقوق،[۱۹] حقوق نسواں،[۲۰] غیر مسلموں کے حقوق،[۲۱] وراثت،[۲۲] دین و دنیا کے باہمی تعلق[۲۳] اور اسلام ترقی و تمدن میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں کھڑی کرتا[۲۴] جیسے موضوعات پر لکھا اور اس حوالے سے مختصر سہی اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے مطابق شبلی ایک کامیاب متکلم اس لیے ہیں کہ وہ اسلام کی مدافعت و محافظت مستشرقین کی خردہ گیریوں سے ہی نہیں کرتے بلکہ اپنے قاری میں اسلام کے عظیم الشان ملی و تہذیبی ورثے پر اعتماد کی بحالی کا کام بھی کرتے ہیں۔[۲۵] شبلی کی تحریریں گزشتہ تعلیم، الجزیہ، حقوق الذمیین، کتب خانہ اسکندریہ، الانتقاد علی التمدن الاسلامی، اورنگ زیب عالم گیر، اسلامی کتب خانے، اسلامی شفاخانے، ہندوستان پر اسلامی حکومت کے اثرات، تزک جہاں گیری، الفاروق وغیرہ وہ تاریخی تصانیف اور مقالات ہیں جن پر علم کلام کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔[۲۶]

شبلی متکلم عصر تھے۔ وہ عہد جدید کے معلم اول ہوں یا نہ ہوں، علم کلام کے حوالے سے ان کی خدمات اس درجے کی بہرحال ہیں کہ انہیں جدید علم کلام کے ماہرین اور مورخین علم کلام کی صف اول میں رکھا جائے۔ انھوں نے علم کلام کی تاریخ لکھی ہو یا علم کلام کے مباحث پر گفتگو کی ہو ہر دو جگہ وہ بغیر کسی مرعوبیت کے دفاع اسلام کا فریضہ انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کی اس طرح کی تحریروں میں استدلال کی قوت بھی ہے اور اعتماد بھی۔ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ علم کلام کے حوالے سے ان کی خدمات کو صحیح تناظر میں پیش کیا جائے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ اس حوالے سے ایک مفید بحث حیات شبلی، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، ۲۰۱۵ء، ص:۶۴ تا ۷۰ ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔
۲۔ علم الکلام اور الکلام، ص:۱۸
۳۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی (اعظم گڑھ) ص:۷
۴۔ علی گڑھ میگزین، اگست ۱۹۴۷ء
۵۔ انسان، مصنف، مصنف گر، ص۸۹۔۲۸۸
۶۔ دیکھیے حیات شبلی ص:۶۴
۷۔ حیات شبلی، ص۴۸
۸۔ شبلی اور ان کی تصانیف، تحقیقی مقالہ آفتاب احمد، ص:۱۰۵
۹۔ معارف شبلی نمبر، ص:۳۴
۱۰۔ شبلی کی علمی وادبی خدمات، ظفر احمد صدیقی، یونی ورسٹی پریس اے ایم یو علی گڑھ، ۲۰۱۲ء، ص:۵۴
۱۱۔ ایضا، ص:۵۶
۱۲۔ معارف شبلی نمبر، کلیدی خطبہ ریاض الرحمٰن خان شیروانی، ص:۳۴
۱۳۔ علم الکلام، ص:۸
۱۴۔ علم الکلام، ص:۲۹
۱۵۔ علم الکلام، ص:۱۵۲
۱۶۔ الغزالی، ناز پبلشنگ ہاؤس، ص:۲
۱۷۔ علم الکلام اور الکلام، ص:۱۸۲
۱۸۔ الکلام اور علم الکلام، ص:۱۸۱
۱۹۔ الکلام اور علم الکلام، ص:۳۰۷
۲۰۔ الکلام اور علم الکلام، ص:۳۰۸
۲۱۔ الکلام اور علم الکلام، ص:۳۲۱
۲۲۔ الکلام اور علم الکلام، ص:۳۱۷
۲۳۔ الکلام اور علم الکلام، ص:۳۸۵
۲۴۔ الکلام اور علم الکلام، ص:۳۶۸
۲۵۔ شبلی کی علمی وادبی خدمات، ظفر احمد صدیقی، یونی ورسٹی پریس اے ایم یو علی گڑھ، ۲۰۱۲ء، ص:۵۵
۲۶۔ ایضا، ص:۷۰

ڈاکٹر وارث مظہری *

فکر اسلامی کی تشکیل جدید

ضرورت اور مسائل

فکر اسلامی نصوص اور عقل کی روشنی میں حقائق حیات وکائنات کی دریافت اور منشائے خداوندی کی معرفت کے حصول کے لیے کی جانے والی کوششوں کا نام ہے جو تقریباً چودہ سو سالوں پر محیط ہے۔فکر اسلامی جس علمی روایت سے تشکیل پاتی ہے وہ بہت گونا گوں اور وسیع ہے۔ وہ بجا طور پر ایک رسی کی مانند ہے جس کی ساخت میں مختلف علوم وافکار کے ریشے شامل ہیں۔اگر ان میں سے کچھ ریشوں کو نکال دیا جائے تو رسی کی پہلی کیفیت اور مضبوطی باقی نہیں رہے گی۔اس علمی روایت میں مختلف مکاتبِ فکر اور جماعتوں کا کردار شامل رہا ہے۔مکتبی اور گروہی اختلافات سے قطع نظر یہ روایت اپنے توسیعی حصے میں ان تمام سے اخذ واکتساب کرتی رہی ہے۔اپنے تہذیبی سفر میں فکر اسلامی کو مختلف چیلنجوں کا سامنا رہا ہے لیکن موجودہ عہد میں درپیش چیلنجز اس کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔

تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اسلامی فکر ایک ایسی بحرانی صورتِ حال سے دوچار ہے جس

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی ای میل:w.mazhari@gmail.com

سے اس کی فعالیت مضمحل ہوکر رہ گئی ہے۔ڈاکٹر محمد عمارہ کے بقول فکر اسلامی کے بحران کی موجودگی پر اصحابِ علم کے درمیان تقریباً اجماع پایا جاتا ہے۔[۱] گویا اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔یہی خیال ڈاکٹر طٰہٰ جابر علوانی کا بھی ہے۔[۲]

دونوں گرامی قدر اسلامی مفکرین کے اتفاق رائے کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ خیال کس شدت کے ساتھ ہمارے ان علمی حلقوں میں پایا جاتا ہے جو فکر اسلامی کے میدان میں سرگرمِ عمل ہیں اور معاصر علمی وفکری دنیا کی صورتِ حال اور اس کے پس منظر و پیش منظر پر نگاہ رکھتے ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ جدیدیت پسند علمی طبقے کے مقابلے میں، روایت پسند علما واسکالرس کا ذہن اس سے خالی ہو اور ان کے یہاں یہ بحث نہ پائی جاتی ہو۔ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ اس حلقے میں بحث کی نوعیت مختلف ہے۔جدیدیت پسند علمی طبقہ اس کے عوامل ومحرکات کو اپنی علمی وثقافتی تاریخ وروایت میں تلاش کرتا ہے اور خارجی عوامل کو ثانوی حیثیت دیتا ہے، جب کہ روایت پسند علمی طبقہ اس کے برعکس فکری بحران کو بنیادی طور پر خارجی عوامل کے تناظر میں دیکھتا ہے جیسے استعمار، مشنریز کی سرگرمیاں اور اعدائے اسلام کی سازشیں وغیرہ۔مشہور الجزائری مفکر مالک بن نبی (م:۱۹۷۳ء) نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''ہم اصرار وتکرار کے ساتھ یہ بات کہتے رہیں گے کہ طویل مدت سے عالم اسلام کو جس بحران کا سامنا ہے اس کا تعلق وسائل سے نہیں بلکہ افکار سے ہے۔جب تک دنیا اس حقیقت کو بخوبی نہ سمجھ لے اس وقت تک ناتجربہ کار عرب اسلامی ملکوں کو لاحق ہونے والا مرض، ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں اس کے بہت پیچھے رہ جانے کی بنا پر لاعلاج بنا رہے گا۔''[۳]

اس بحران کا ایک اہم مظہر یہ ہے کہ اسلامی فکر کے سامنے جو چیلنجز ہیں اس کا ادراک کرنا، اس کے لیے مشکل ہے۔خود اس سوال کے بے شمار جوابات ہیں کہ مسلم فکر کا انتشار یا مسائل کیا ہیں اور ان کا حل کیا ہے؟ یہ سوال تو یقیناً ایسا ہے کہ اس کے متعدد جوابات ہوں۔لیکن جو مسئلہ پریشان کن ہے، وہ یہ ہے کہ مرض کا جو علاج پیش کیا جاتا ہے وہ نہایت مبہم ہے۔بایں وجہ اسلامی امت کی نظر میں اس کے

مستقبل کی کوئی واضح تصویر نظر نہیں آتی۔ جو تصویر بنائی جاتی ہے اس کی کوئی منطقی اساس اشعری فکر پر مبنی اس تصور کے علاوہ نظر نہیں آتی کہ چوں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے، وہ انسانی تاریخ میں معجزات کو وجود میں لاتا رہا ہے، اس لیے ماورائے تاریخ ایسے واقعات وجود میں آسکتے ہیں جو امت کی سوئی تقدیر کو جگا کر اسے امم عالم کی پہلی صف میں کھڑا کر دیں۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی حقیقت

سترہویں صدی سے بیسویں صدی کے دوران علم وفکر اور اکتشاف وایجاد کی دنیا میں جو انقلابات رونما ہوئے، انھوں نے انسانی فکر کی بساط الٹ کر رکھ دی۔ حیات وکائنات میں غور وفکر کے پیمانے بدل گئے۔ ارسطو کی کونیاتی فکر (Aristotelian consmology) سترہویں صدی میں شکست وریخت سے دوچار ہو چکی تھی۔ پھر بیسویں صدی تک آتے آتے سائنس اور فلسفے کے بہت سے مسلمات تبدیل ہو گئے۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں ان مابعد الطبیعاتی حقائق وتصورات کو بھی سمجھنے اور پرکھنے کے فکری زاویے بدل گئے جن پر مختلف مذہبی تصورات کی اساس قائم ہے۔ فلسفہ وسائنس کے میدان میں حیرت انگیز پیش رفت اور ان سے ترکیب پانے والی کوسمولوجی نے مذہبی فکر کے حاملین کے سامنے نئے سوالات کھڑے کیے جن سے پہلو بچانا اس اعتراف کے بغیر ممکن نہیں رہا کہ اسلامی فکر ان سوالات کا جواب دینے کی اہلیت اپنے اندر نہیں رکھتی یا ایسی کوشش وفکر اس کی روایت ومزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ حالاں کہ اسلامی فکر کے مزاج وساخت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ دونوں باتیں صحیح نہیں تھیں۔ اصلاً تو یہ سارے سوالات بائبل کے متون کو پیش نظر رکھ کر کیے گئے تاہم بنیادی عقائد میں اشتراک کی وجہ سے ان کی زد براہِ براست اسلام پر بھی پڑتی تھی۔ مسیحی ویہودی علمانے اپنے طور پر ان کا جواب دینے کی سعی کی اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، انھیں اپنے مخصوص مذہبی فکری ڈھانچے کی بنیاد پر مختلف نظریاتی محاذوں پر جدید سائنسی وفلسفیانہ نظریات کے ساتھ سمجھوتا کرنا پڑا۔ یہ ایک بین حقیقت ہے کہ اسلام کا معاملہ اس سے قطعاً مختلف ہے۔ تاہم ان سوالات کے تعلق سے پہلو بچانے یا خاموشی اختیار کرنے کا رویہ اسلامی فکر کے لیے تعمیری نہیں ہوسکتا۔ موجودہ دور میں استعمار کی چوٹ کھائی ہوئی اسلامی فکر کی نمائندہ نسل نے اسلام پر جدید اسلامی نسل کے اعتماد کی بحالی کے لیے اس کے سیاسی وسماجی اور

معاشی وقانونی نظام کی ترتیب وتشریح پر اپنی توجہ مرکوز رکھی، جس کا مقصد اسلام کے اجتماعی نظام کے عملی تصور کو بحال کر کے نئی نسل کو یہ یقین دلانا تھا کہ اس کے اندر جدید تقاضوں کے مطابق ترقی یافتہ انسانی سماج کی تشکیل کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن اسلامی فکر نے جدید سیاسی وسماجی سیاق میں اپنے مشمولات کو اس لحاظ سے سنجیدگی کے ساتھ موضوع نہیں بنایا کہ خود ان کے اندر زمانی تعامل کے نتیجے میں جو نقائص پیدا ہو گئے ہیں جن کا ازالہ ضروری ہے۔

جدید سائنس اور فلسفے نے انسان، خدا اور کائنات کے بارے میں جو نئے مفروضات تراشے اور ان کے حق میں نظر واستدلال کے جو نئے معیارات قائم کیے ہیں وہ مذہب میں گہرا یقین رکھنے والوں کی نگاہ میں خواہ کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں لیکن انسانی ذہن پر ان کے اثرات عمیق اور دور رس ہیں۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے مسائل ومشکلات

فکر اسلامی کی تشکیل جدید جس قدر ضروری ہے اسی قدر وہ مشکل اور حساس بھی ہے۔ اگر اس کے امکانات پر نظر ڈالیں تو چند باتیں فوری طور پر ذہن میں آتی ہیں: اسلامی فکر کی نمائندہ نئی نسل میں اس کی ضرورت کا احساس شدید تر ہے۔ بیسویں صدی میں ظہور پذیر ہونے والی اسلامی تحریکات خاص طور پر جو اسلام کی اجتماعی وتہذیبی شناخت کے دوبارہ قیام اور مسلم معاشرہ کی اصلاح یا تنظیم نو کا ہدف لے کر سامنے آئی تھیں، انھیں اپنے مقاصد میں بمشکل جزوی کامیابی حاصل ہو سکی۔ (اگر یہ کہنا درست نہ ہو کہ وہ ان کے حصول میں ناکام رہیں) سنجیدہ اور مخلص مسلم دانش وروں کی ایک کھیپ مشرق ومغرب دونوں ہی حلقہ ہائے فکر میں پائی جاتی ہے۔ عالم اسلام میں اعلیٰ سطح کے غیر حکومتی علمی وفکری ادارے ادھر چند دہائیوں میں قائم کیے گئے ہیں وہ اپنی حکمت عملی طے کرنے اور عملی سرگرمیوں میں آزاد ہیں۔ خود مسلم حکومتوں کے اندر اس رجحان میں اضافہ ہوا ہے کہ اسلامی فکر کے مختلف موضوعات ومباحث پر نئے سیاسی وسماجی تناظر میں غور وفکر کی تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ چوں کہ اس نوع کا کام حکومتی تعاون سے بالکلیہ دست کش ہو کر نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اس کی اپنی اہمیت مسلم ہے۔ مشرق کی نوآبادیاتی عہد میں نمو پانے والی اسلامی فکر اور مغرب کی تحریک استشراق کے جلو میں مضبوط ہونے والی

تفہیمِ اسلامی کی مدعی فکر کی کمزوریاں اب خود ان پر اچھی طرح واضح ہو چکی ہیں، لیکن امکانات کے مقابلے میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کو جو مسائل درپیش ہیں ان کی حقیقت کا صحیح ادراک ضروری ہے تا کہ ان کا موزوں حل دریافت کیا جا سکے۔

میری نظر میں سب سے اہم چیلنج مغربی فکر کے مقابلے میں اسلامی فکری روایت کی خصوصیات و امتیازات کا تحفظ اور موجودہ اسلامی نسلوں کے اندر اس احساس و شعور کو بحال رکھنا ہے کہ اسلامی فکر و ثقافت اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ وہ مغربی فکر و ثقافت کا ضمیمہ نہیں ہے، مغرب کی طرف سے جس کی کوشش گزشتہ تقریباً ۲۰۰ سالوں سے شدت کے ساتھ کی جاتی رہی ہے دوسرا بڑا چیلنج یہ ہے کہ عالم اسلام کے مختلف حلقہ ہائے فکر میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے حوالے سے جو سرگرمیاں پائی جاتی ہیں، ان پر ان سیکولر مسلم دانش وروں کا غلبہ ہے جو مغربی نمونے پر اسلامی فکر کی تشکیل کے خواہاں ہیں۔ مغرب کے لادینی یا مسیحی ماڈل پر اسلامی فکر کو ڈھالنے کی کوشش کوئی نیا ظاہرہ نہیں ہے۔ نیا ظاہرہ یہ ہے کہ بڑی سطح پر اکیڈمک حلقوں میں اب یہ فکر بحث و تحقیق کا موضوع ہے۔ اسی پر یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگریاں تحقیق کاروں کو عطا کی جاتی ہیں۔ اسلامی روایت کی نمائندہ فکر بہت حد تک اصول دین و شریعت کی کلیات تک محدود ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں غالب روایت پسندانہ فکر اس نوع کے موضوعات کو ہی سرے سے قابلِ اعتنا تصور نہیں کرتی۔ اگر کرتی ہے تو اس کا اسلوب معاصر معیار سے اس قدر فروتر ہوتا ہے کہ علمی و تدریسی حلقوں میں اس کی قدر اور اس کا وزن محسوس نہیں کیا جاتا۔ اسلامی روایت کے تصور میں روایت پرست اور تجدد پرست دونوں حلقہ ہائے فکر کے درمیان تضاد پسندی اور افراط و تفریط کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ روایت پسندانہ فکر روایت کو اسلامی فکر کے میوزیم میں رکھی ہوئی چیز تصور کرتی ہے جس کی اصل قیمت اور خوبصورتی اس کی قدامت میں پوشیدہ ہے۔ روایت پسندانہ ذہن کو یہ باور کرانا ہے کہ روایت ایک زندہ اور متحرک عمل کا نام ہے اور تاریخ کے دورانیے میں خود روایت کی تجدید کا عمل جاری رہتا ہے۔ روایت کی روح اور بنیادی عناصر ترکیبی میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی لیکن اس کے خد و خال جزوی تبدیلیوں سے گزرتے رہتے ہیں۔ اس کے مزاج میں ایسی لچک پائی جاتی ہے۔ (یا پائی جانی چاہیے) کہ وہ ظروف زمان و مکان کے تحت خود کو ڈھال سکے۔ وہ مسیحی روایت کی طرح بے لچک نہیں ہے کہ اس کے انقطاع یا

شکست کے بغیر اسے خود کو نئے قالب میں ڈھالنا ممکن نہ ہو۔

دوسری طرف سیکولر جدیدیت پسند دانشوروں کا طبقہ روایت کی تحریک وارتقا کے مقابلے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی تشکیل وایجاد کا قائل ہے۔ اس کی وجہ روایت سے اس کے انقطاع کا رجحان ہے۔ یہ انقطاعی رجحان سیکولر جدیدیت پسند رجحان میں بہت واضح ہے۔ جدیدیت پسند عرب دانش وران: محمد ارکون، حسن حنفی، نصر حامد ابوزید، ہشام جعیط، علی حرب، جلال صادق العظم، محمد النویہی وغیرہ کی کھیپ اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ ان پر مصطفیٰ صادق الرافعی کا یہ فقرہ درست طور پر چسپاں ہوتا ہے کہ یہ لوگ دین، زبان اور چاند سورج کو تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔[۴]

ایک اہم مسئلہ خود تشکیل جدید کے تصور میں پایا جانے والا ابہام ہے۔ اصحاب علم کے مختلف طبقات وحلقات پر اس کی حقیقت واضح نہیں ہے۔ روایت پرست علماء کی ایک بڑی تعداد اس کو منفی تناظر میں دیکھتی ہے۔ وہ یہ تصور رکھتی ہے کہ اسلامی فکر کی تعبیر نو صرف اہل تجدد کا نعرہ ہے جس کی وجہ مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور ترقی پسند کا شوق ہے۔[۵] اگر وہ وقت اور حالات کے زائیدہ ہیں تو یہ حالات بھی دراصل مغرب کے ہی پیدا کردہ ہیں۔ لیکن یہ صرف نصف حقیقت ہے۔ یہ علوم جن کے بطن سے یہ سوالات وموضوعات سامنے آئے ہیں، ان کا ارتقا اور تشکیل مغرب میں ضرور ہوئی ہے لیکن وہ فی نفسہ انسانی علوم ہیں نہ کہ محض مغربی علوم۔ یہ الگ بات ہے کہ مغرب کی مادی سیکولر فکر کے قالب میں ڈھل کر یہ علوم بظاہر مادیت کے نقیب بن چکے ہیں۔ درحقیقت علم کی شناخت جغرافیے، نسل اور زبان سے نہیں کی جاسکتی۔ انسانی ذہن وفکر کی داخلی فطرت اور صدیوں کے تعامل سے ارتقا پانے والا انسانی شعور ہی اپنی ماہیت میں وہ چیز ہے جو اس نوعت کے سوالات وموضوعات کا محرک ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ سرے سے اس کے دائرے میں آتے بھی ہیں یا نہیں، شعور ایک حرکی چیز ہے جو فکر کو اس سطح پر متحرک رکھتی ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں ہوسکتی۔ دراصل اس طبقے کی یہی وہ نفسیات ہے جس نے اسلامی فکر کو جدید امکانات سے استفادہ کرنے سے صدیوں تک روکے رکھا اور اب بھی روکے ہوئے ہے۔

اس کا شدید احساس اب علمی حلقوں میں پایا جاتا ہے کہ موجودہ عہد میں اسلامی فکر کے استحکام کے لیے استغراب (Occidentalism) بہ مقابل ''استشراق'' (Orientalism) کی ضرورت

ہے۔یعنی مغربی علوم وافکار سے گہری شناسائی ومعرفت کا حصول کہ اس کے بغیر فکر اسلامی کو جو چیلنجز آج درپیش ہیں ان کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ 'استغراب' 'تغریب' سے مختلف ہے۔ تغریب کا مطلب ہے: اپنی فکر وثقافت کو مغربی فکر وثقافت کے سانچے میں ڈھال دینا۔اس میں شک نہیں کہ دورِ جدید میں اسلامی جدیدیت کی جو تحریکات مختلف اسلامی وغیر اسلامی ممالک میں شروع ہوئیں، ان میں یہ رجحان بھی شامل تھا۔لیکن زیادہ مضبوط رجحان یہ تھا کہ مغربی علوم وافکار کے حصول کے ذریعہ اسلامی فکر کے دفاع کی کوشش کی جائے۔ جو لوگ ان دونوں رجحانات میں فرق نہیں کر پائے انھوں نے ان دونوں کو مغرب کی تقلید محض کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی اور اس سے اسلامی حلقوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔

اسلامی فکر کی معاصر تشکیل یا ارتقاء کے حوالے سے ایک مسئلہ وہ ہے جو قدیم وجدید یا اصالت ومعاصرت کی تقسیم وتفہیم سے عبارت ہے۔لیکن وہ اسلامی فکری روایت کا خاصہ نہیں ہے۔ دنیا کے مختلف معاشروں میں تشکیل پانے والی علمی وفکری روایت ہمیشہ اس مسئلے سے دوچار ہوتی رہی ہے۔ ہر قوم اپنی روایت سے ایسا گہرا انس اور نفسیاتی تعلق قائم کر لیتی ہے کہ جب اسے محسوس ہوتا ہے کہ معاشرتی تبدیلیوں کے زیرِ اثر اس کی علمی روایت پر سوالات اٹھ رہے ہیں تو اس کا ردعمل سخت اور منفی ہوتا ہے۔اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے فکری وجود کو چیلنج کرنے کی کوشش کی جارہی ہو، اس لیے اس کی مزاحمت کرنا اس کا اجتماعی فریضہ ہے۔اسے اس حقیقت کے ادراک میں دیر لگتی ہے کہ ہر روایت یا نظام فکر خواہ وہ کتنی ہی مضبوط ومستحکم کیوں نہ ہو، اس کا ایک حصہ وقت اور حالات سے تاثر پذیر ہوتا ہے اور اس کی تشکیل میں زمانی ومکانی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔اسلامی فکر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔

نظریاتی مشکلات کے ساتھ کچھ عملی مشکلات بھی اس راہ میں حائل ہیں جن پر بحث وگفتگو ضروری ہے۔اگر چہ یہ عملی مشکلات بھی بہت حد تک نظری مشکلات اور تصوراتی ابہامات کی ہی زائیدہ ہیں۔

سب سے بڑا مسئلہ اسلامی علم و دانش کے حلقوں میں جزوی مسائل پر حد سے زیادہ ارتکاز ہے۔فقہ کے ایسے فروعی مسائل جن پر سینکڑوں کتابیں مختلف زبانوں میں لکھی جا چکی ہیں،

جن پر تحریر و تحقیق کا ماحصل اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ درجنوں کتابوں کے مشمولات کو اپنے الفاظ و اسلوب میں بس دہرا دینے پر اکتفا کیا جائے یا ان پر حواشی لگا دیے جائیں اور یہ حواشی بھی کسی جدت و ندرت سے خالی ہوں۔ مثلاً عالم عرب کے ایک مشہور عالم ابو اسحاق دمیاطی نے وضو کے احکام پر ۷۰۶ صفحات پر مشتمل کتاب ''**کشف الغوامض فی احکام الوضوء و النواقض**'' تحریر کی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ وضو کا مسئلہ کیا واقعی اس قدر پیچیدہ اور تحقیق طلب ہے کہ اس پر کوئی پونے سات سو صفحات خرچ کر دیے جائیں۔ جب کہ قرآن میں صرف ایک آیت میں وضو کا حکم اور طریقہ بتایا گیا ہے۔ فضیلت کے علاوہ صرف چند احادیث وضو کے پورے مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس کا ایک پہلو تو یقیناً متاخرین فقہاء و اصحاب فتاویٰ کے طرزِ عمل سے تعلق رکھتا ہے، جنھوں نے وقت کے جدید اجتہادی مسائل سے اغماض برتتے ہوئے قدیم فروعی مسائل کو ہی تصنیف و تحقیق کا میدان بنانے کی کوشش کی۔ لیکن ضروری ہے کہ اسلامی فکر کے مسائل کے حوالے سے علمی حلقے اپنی ترجیحات کا تعین کریں۔ دینی فکر کی تعبیر نو کے اصل مکلّف اور اس ضرورت کے مخاطب وہ علمائے دین ہیں جو اس کی اہلیت کی شرائط کی تکمیل کرتے ہیں تاہم اس عمل میں اصحاب علم کے مختلف دوسرے طبقات کی شرکت ضروری ہے، جو اپنی مہارتوں اور اختصاصات کے حوالے سے فکر اسلامی کے ارتقا و تشکیل کے عمل میں معاون بن سکیں۔ بدقسمتی سے نو آبادیاتی عہد میں علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے مابین جو خلیج پیدا ہو گئی تھی وہ پر نہیں ہو سکی۔ ان دونوں طبقوں کے مابین جب تک ایک مستحکم تال میل قائم نہ ہو اس وقت تک فکر اسلامی کے ارتقا و تشکیل کا عمل درست منہج پر آگے نہیں بڑھ سکتا۔

چند اہم فکری مسائل پر ایک نظر

اس عنوان کے تحت ہم چند نمائندہ مسائل کا تجزیاتی مطالعہ کریں گے تاکہ ان کے حوالے سے فکر اسلامی کی تجدید کا تطبیقی رخ سامنے آ سکے۔ اس ضمن میں ہم نے صرف تین مسائل کا انتخاب کیا ہے۔ یہ تین مسائل ہیں: اسلامی سیاست، اسلام اور غیر مسلم اور اسلامی شریعت میں عورت کی حیثیت۔

اسلام اور سیاست

دور جدید میں جدیدیت کے ساتھ اسلامی فکر کے تعامل کے حوالے سے جو چیلنجز پیش آئے، اس کی مختلف نوعیتیں ہیں، لیکن ان میں سب سے اہم چیلنج وہ ہے جس کا تعلق اسلام کی سیاسی فکر سے ہے۔ اجتہادی وتجدیدی فکر کا سب سے اہم تقاضا اسلام کی سیاسی فکر کو مرکز توجہ بنانا اور اس میں پائی جانے والی دشواریوں اور پیچیدگیوں کو دور کرنا تھا، لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ یوسف قرضاوی نے بجا طور پر اسلامی حلقہ ہائے فکر سے اس تقصیر کا شکوہ کیا ہے۔[۶] اسلامی سیاسی نظریات کی تشکیل دورِ حاکمیت کے مخصوص ماحول میں ہوئی ہے۔ اس کلیے کو تقریباً سبھی اہلِ علم تسلیم کرتے ہیں لیکن اس سے گریز کرتے ہیں کہ اب دورِ محکومیت میں اس کی معنویت پر جو سوالات اٹھ رہے ہیں، ان کا جواب کس طرح دیا جائے اور پیش آمدہ مشکلات کا حل کس طرح نکالا جائے؟ مسلم سیاسی فکر میں پائے جانے والے خلا کو خلافت کے خاتمے کے بعد گزشتہ سو سالوں کے دوران نہایت شدت کے ساتھ محسوس کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن عام طور پر اس سے نظریں چرانے کی کوشش کی گئی۔ موجودہ نسل کو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ جیسے اس حوالے سے نظریے اور عمل میں مطابقت اور ہم آہنگی کی بظاہر کوئی شکل باقی نہ رہ گئی ہو۔ مطابقت پیدا کرنے کی ہر کوشش مختلف النوع تناقضات کو جنم دیتی محسوس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سیکولرزم کو لیجیے۔ غیر مسلم ممالک میں اقلیت کی حیثیت سے مقیم مسلمانوں کے لیے یہ نظریہ خدا کی بیش بہا نعمت کی حیثیت رکھتا ہے، جبکہ جن ممالک کے اندر مسلمان اکثریت میں ہیں ان کے علماء کی نگاہ میں وہ کفر ولادینیت کے ہم معنی ہے۔ پروفیسر مشیر الحق نے اپنی کتاب "Islam in Secular India" میں اس تضاد پسندی کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بہت سے علما کا خیال یہ ہے کہ اسٹیٹ کو تو سیکولر رہنا چاہیے لیکن مسلمانوں کو سیکولرزم سے بچانا اور محفوظ رکھنا چاہیے۔''[۷]

حقیقت یہ ہے کہ سیکولرزم کو اس کے صحیح تناظر میں سمجھنے میں مسلم مذہبی حلقوں میں غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ سیکولرزم کو کلّی طور پر مذہب کا مخالف بلکہ اس کی ضد سمجھا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اردو میں اس کا ترجمہ ''لادینیت'' کیا جاتا ہے جو سراسر غلط ہے۔ مشہور عرب اسکالر عبدالوہاب میسری نے

سیکولرزم کی دو خانوں میں تقسیم کی ہے: کلی یا جامع سیکولرزم (**العلمانية الشاملة**) اور جزوی سیکولرزم (**العلمانية الجزء ية**) کلی سیکولرزم وہ ہے جو مذہب کو انسانی زندگی اور سماجی میں کوئی بھی مقام دینے کو تیار نہیں، یہی سیکولرزم کا مغربی تصور ہے جبکہ جزوی سیکولرزم مشترکہ سماج میں مذہب کو سیاست سے دور رکھنے کو ضرورت کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ کیوں کہ ایسے سماج میں یہی صورت قابلِ عمل ہے اور ہندوستان سمیت مشرقی ممالک میں سیکولرزم کا تصور اسی معنی میں رائج ہے۔

اسی طرح قرآن کی بعض آیات (توبہ:۳۳، صف:۹) سے اسلام کے عالمی سیاسی غلبے کا تصور اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، حالاں کہ متعدد صحابہ اور قرونِ اولی کے علما و مفسرین کے اقوال موجود ہیں کہ وہ ان آیات سے یہ معنی اخذ نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ ضحاک بن مزاحم اور عبدالرحمٰن السدی (تابعین) وغیرہ کے نزدیک یہ غلبہ حضرت عیسیٰ کے نزول یا امام مہدی کے خروج کے وقت ہوگا۔ جب کہ حضرت عبداللہ ابن عباس کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ کو شرائع دین کی مکمل معرفت عطا کی گئی ہے۔ قرطبی نے غلبہ سے دلیل و برہان کے ذریعہ (فکری و نظریاتی) غلبہ مراد ہے۔ (**ای بالحجة و البراهين**)[۸]

ارتداد اور توہین رسالت کا مسئلہ ان مسائل میں سے ایک ہے، جن کو بنیاد بنا کر اسلام مخالف حلقوں میں بڑے پیمانے پر اسلام کو طعن و تشنیع کا ہدف بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ رسول اللہ کے تعلق سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ آپ نے کسی کو ارتداد کے جرم میں قتل نہیں کرایا۔ ڈاکٹر طہٰ جابر علوانی لکھتے ہیں: ''**انه من الثابت المستفيض انه لم يقتل مرتدا طيلة حياته الشريفة**'' یہ بات پورے طور پر ثابت ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی پوری زندگی میں کسی کو ارتداد کے جرم میں قتل نہیں کرایا۔[۹] یہ اور اس طرح کے متعدد سیاسی مسائل ہیں جن پر اسلامی فکر کی تشکیل نو کے ضمن میں غور و خوض وقت کا تقاضا ہے۔

اسلام اور عورت

دوسرا اہم مسئلہ وہ ہے جس کا تعلق اسلامی روایت میں عورت کی حیثیت اور مقام سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی فقہی و قانونی روایت میں مسلم عورت کی شخصیت کی درست تعبیر و تفہیم نہیں کی جاسکی۔ عورت کو ایک باندی اور یا نیم انسانی شخصیت سے زیادہ حیثیت نہیں دی گئی۔ مثلاً غور فرمائیں سورہ

الروم کی آیت ۲۱ ''اوراس کی نشانیوں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے تا کہ تم ان کی طرف آرام پاؤ'' کی تشریح میں امام رازی لکھتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ کا فرمان کہ اس نے عورت کی شکل میں تمہارے لیے تمہارے جوڑے بنائے، اس بات کی دلیل ہے کہ عورتوں کو جانوروں اور پیڑ پودوں وغیرہ کی طرح ہمارے منافع کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔(''**قوله خلق لكم دليل على ان النساء خلقن كخلق الدواب و النبات وغير ذلک من المنافع**'')[۱۰]

رازی کا خیال ہے کہ عورت اپنی ضعیف الخلقی میں بچے کی طرح ہے۔ اس لیے مناسب تو یہ تھا کہ اسے شرعی احکام کا مکلّف ہی نہ کیا جائے لیکن اسے اس لیے شریعت کا مکلّف کیا گیا کہ: ''ہم مردوں پر خدا کی نعمتوں کا اتمام ہو۔ وہ خدا کے عذاب کا خوف کھا کر شوہر کے تابع اور فرماں بردار رہیں۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہو تو فساد پھیل جائے گا۔''[۱۱] رازی جیسی اسلامی تعقل ودانش کی علامت شخصیت اگر عورت کے بارے میں یہ موقف رکھتی ہے تو اس سے مسئلے کی سنگینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غزالی کی نگاہ میں چوں کہ عورت کی عقل میں نقص پایا جاتا ہے، بنابریں: ''کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ان کی رائے پر غور وفکر کرے اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے اقوال کی طرف توجہ دی جائے۔ مردوں کو جو بھی آزمائش اور ہلاکت ومصیبت پیش آئی ہے، اس کی وجہ عورت ہے۔ (**لايجوز لاحد ان يتدبر أيهن و لا يتلفت الى اقوالهن. كل ما ينال الرجل من البلاء و الهلاک وغير ذالک فبسبب النساء**)[۱۲] ناقص العقل ہونے کا مطلب بعض فقہا کی تصریح کے مطابق یہ ہے کہ عقل کے چار درجوں میں سے آخری دو درجے کی عقل: عقل بالفعل اور عقل مستفاد اس کے اندر نہیں پائی جاتی جن سے وہ کما حقہ اشیا کا گہرائی کے ساتھ ادراک کر سکے۔[۱۳] اس لیے علمائے مجتہدین کی اکثریت کسی بھی ایسے معاملے میں عورت کو قابل اعتبار تصور نہیں کرتی جس میں ایک فعال اور تجزیہ کار عقل کی ضرورت ہو۔ اسی لیے ایسی تمام ذمہ داریوں اور مناصب کے حوالے سے اس کی نااہلیت پر مہر لگا دی گئی ہے۔ دوسرے مسائل کی طرح اس مسئلے میں اس ''فراخ دلی'' کا اظہار نہیں کیا جا سکا کہ جس حدیث میں عورت کے ناقص العقل ہونے کی بات کہی

گئی ہے،اس کی کوئی موزوں تاویل کی جا سکے۔ حالاں کہ حدیث کے الفاظ وسیاق پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اس مقصد سے نہیں کہی بلکہ مزاح یا تعجب کے اظہار کے طور پر کہی ہے۔[۱۴]

اسی طرح جمہور کی متفقہ رائے کے مطابق عورت کسی اسلامی ریاست کی سربراہ نہیں ہوسکتی۔ لیکن موجودہ عہد میں مولانا اشرف علی تھانوی اور یوسف قرضاوی جیسے مستند علما اس سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ مولانا تھانوی کی نظر میں ایسی شخصی حکومت جس میں اختیار کل شخص واحد کے پاس ہوتا ہے، ایسی حکومت کی سربراہی کی حدیث میں ممانعت کی گئی ہے جب کہ موجودہ عہد کی جمہوری حکومتوں میں قانون کی تشکیل وتنفیذ مجلس نمائندگان کے باہمی مشوروں سے ہوتی ہے۔[۱۵] شیخ قرضاوی بھی اسی کے قائل ہیں۔[۱۶] وہ حدیث **لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ** (وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی جس نے حکمرانی کسی عورت کے سپرد کی ہو۔)[۱۷] کو ایران کی مخصوص صورتِ حال پر محمول کرتے ہیں جہاں وراثتی نظام کے تحت باصلاحیت لوگوں کے رہتے ہوئے ایک عورت کو حاکم بنادیا گیا تھا۔[۱۸] اب کثیر تعداد میں دیگر علما بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔

اسلام اور غیر مسلم

تیسرا اہم مسئلہ اسلام اور غیر مسلموں کے مابین تعلقات و معاملات سے متعلق ہے۔ اسلامی فکر میں اس حوالے سے بہت زیادہ افراط وتفریط کی کیفیت پائی جاتی ہے اور اس کا تعلق دونوں پہلوؤں سے ہے۔ غیر مسلم اسلامی ریاست کے شہری ہوں یا مسلمان غیر مسلم ریاست کے، فقہ الاقلیات کے حوالے سے اب ان مسائل کے مختلف پہلو زیرِ بحث ہیں اور ایسا اس لیے ہے کہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد (تقریباً ۴۵ فصدی) غیر مسلم ریاستوں میں آباد ہیں جن کے دینی وسیاسی وجود کی بقا وتحفظ کے لیے شرعی احکام میں قدرے گنجائش نکالنا مجبوری بن گئی ہے، ورنہ بصورتِ دیگر وہ مسائل جن میں ایسی مجبوری دامن گیر نہیں ہے، اصحابِ علم وفتویٰ کی اکثریت غور وفکر کرنے کے لیے تیار نظر نہیں آتی۔ ذمی کی عصری معنویت پر سوالات اٹھتے رہے ہیں اور اس پر بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ بعض روایتی دینی حلقوں کا اس پر اصرار رہا ہے کہ ذمہ اور اس پر مرتب ہونے والے

احکام (مثلاً جزیہ کی ادائیگی) چونکہ اسلامی ریاست کے تصور اور عملی ڈھانچے کا لازمی جز ہیں، اس لیے ان سے انحراف جائز نہیں ہے۔ جب کہ معاصر علما کی اکثریت اس نظریے سے اتفاق رکھتی ہے کہ سیاسی وسماجی سیاق کی تبدیلی کی وجہ سے اس تصور کا عملی انطباق ممکن نہیں رہا۔ یہی دوسری رائے متوازن اور اسلام کے مزاج ومقاصد اور شریعت کی روح کے موافق محسوس ہوتی ہے۔[19] علی محی الدین قرہ داغی[20] اور ان جیسے اصحابِ علم وفکر اس امر کو پوری قوت کے ساتھ ثابت کرتے ہیں۔ ان کی اور اس قبیل کے دیگر علما کی بنادی دلیل یہ ہے کہ غیر مسلمین مسلمانوں کی طرح ہی اسلامی ممالک کے باضابطہ شہری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ ان ممالک کی استعمار سے آزادی یا ان کی تشکیلِ نو میں ان کا بھی مشترک کردار رہا ہے۔ اب موجودہ دور میں ان کے تعلقات ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے کو پناہ دینے جیسے تصور پر قائم نہیں رہے:

> **ان غیر المسلمین صاروا شرکاء اصلیین فی أوطان المسلمین ولم تعد علاقاتهم بالمسلمین قائمة علی إجارة قبیلة لقبیلة أخری.**
>
> ''غیر مسلمین مسلمانوں کے ممالک میں اصل شرکا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات ایک قبیلے کے دوسرے قبیلے کو پناہ دینے کی بنیاد پر قائم نہیں رہے۔''[21]

اب ذمہ کے تصور کی جگہ موجودہ سیاسی تناظر میں شہریت کے تصور نے لے لی۔ حقیقت یہ ہے کہ اب ذمہ کے تصور کی معدومیت کے ساتھ جزیہ کا تصور بھی معدوم ہوگیا۔ اب شہری ہونے کی حیثیت میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ اس طرح دونوں کے فرائض اور ذمہ داریاں یکساں اور اس بناپر حقوق بھی یکساں ہیں۔ زمان ومکان کی اس تبدیلی سے قطع نظر کتاب وسنت کا وہ تصور جس پر خلافت راشدہ اور بعد کی صدیوں میں عمل ہوتا رہا، اس میں اسلامی ممالک کے غیر مسلم شہریوں کے لیے جو حقوق متعین کیے گئے ہیں، ان میں غیر مسلموں کے حقوق وواجبات کی ضروری سطح پر رعایت کی گئی ہے۔ البتہ عہدِ وسطیٰ کے مخصوص سیاسی وسماجی اور اسلامی سیاسی غلبے کے ماحول میں بعض مسلم حکمرانوں کی طرف سے اس تعلق سے بعض نارواقدامات ضرور سامنے آئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ

اس کی ذمہ داری اسلام پر عائد نہیں ہوتی۔ مسلم اصحابِ دانش کی مجموعی رائے کے مطابق ان حکمرانوں سے اسلام کے سیاسی نظریات کی نمائندگی نہیں ہوتی۔

خلاصۂ کلام

اقبال نے The Reconstruction کے چوتھے خطبے The Human Ego - His Freedom and Immortality (انسانی خودی: اس کی آزادی اور لافانیت) میں لکھا ہے کہ:

> The task before modern Muslim is, therefore, immense. He has to rethink the whole system of Islam without completely breaking with the past.
>
> ''دورِ حاضر کے مسلمانوں کو یہ اہم مسئلہ درپیش ہے کہ وہ ماضی سے رشتہ منقطع کیے بغیر اسلام کے پورے نظام پر از سرِنو غور و فکر کریں۔''[۲۲]

اقبال کی یہ بات بہت اہم ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام کی پوری فکری عمارت کو ڈھا کر نئی عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق، اسلام کے مجموعی نظامِ فکر کو معاصر علمی و عقلی استدلالات کی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے لیے ہمیں اپنی دینی فکر کے بنیادی اصولوں سے سمجھوتے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دین کے عنوان سے جو رطب و یابس دین کا حصہ بن گئے ہیں، ان کی تنقیح کی جائے۔ اس وقت اسلامی فکر کو دوہرا چیلنج درپیش ہے: ایک طرف روایت اور روایتی اصول کی پاس داری سے دست کشی کی صورت میں خطرہ ہے کہ اسلامی ثقافت جدید مغربی ثقافت کا محض ضمیمہ بن کر نہ رہ جائے۔ لیکن دوسری طرف موجودہ سماجی و ثقافتی مسائل کے حل کے لیے نپا تلا اور جامد فکری منہاج بھی کافی نہیں ہے۔ اسلامی فکر کو ایک ایسے متوازن منہاج کی ضرورت ہے جو روایت سے اپنا مضبوط رشتہ قائم رکھتے ہوئے جدیدیت کی صالح قدروں سے استفادہ کر سکے اور معاصر دنیا میں اسلام کی درست نمائندگی کے حوالے سے اپنا متوقع کردار ادا کر سکے۔

حواشی

۱۔ ازمة الفکر الاسلامی المعاصر ——محمد عمارۃ، دار الشرق الاوسط للنشر،قاھرۃ ،سن غیر ندارد، ص:۱٦

۲۔ اصلاح الفکر الاسلامی: بین القدرات و العقبات،طه جابر علوانی،المعھد العالمی للفکر الاسلامی، ورجینیا،۱۹۹۱ء،ص:۱۲

۳۔ مشکلة الثقافة—— مالک بن نبی،ترجمہ:عبدالصبور شاہین،دار الفکر ، دمشق،۲۰۰۰ء،ص:۱۷۷

۴۔ ثقافتنا بین الانفتاح و الانغلاق —— یوسف القرضاوی،دار الشرق،القاھرۃ،۲۰۰۰ء،ص:۵٦

۵۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید:محرکات اور ضرورت-مجیب اللہ ندوی، مقالہ در فکر اسلامی کی تشکیل جدید،مرتبین: ضیاء الحسن فاروقی،مشیر الحق، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ،نئی دہلی، مکتبہ رحمانیہ، لاہور،سن ندارد،ص:۸۳-۸۵

٦۔ من فقه الدولة فی الاسلام-یوسف القرضاوی،دار الشرق، القاھرۃ،۲۰۰۵ء،ص:۷

7. MushirulHaq,Islam in Secular India, Shimla: Indian Institute of Advanced Study1972p.12

۸۔ الجامع لاحکام القرآن ——ابوعبداللہ القرطبی،دار الکتب العلمیه، بیروت ،۱۹۸۸ء(ج:۷) ص:۸۷،مزید حوالوں کے لیے دیکھیے :جامع البیان فی تفسیر القرآن——ابوجعفر محمد بن جریر الطبری، معالم التنزیل ——ابومحمد بن مسعود البغوی، انوار التنزیل و اسرار التاویل ——عبداللہ بن عمر البیضاوی، بذیل آیت مذکور۔

۹۔ اشکالیة الردة و المرتدین من صدر الاسلام الی الیوم—— طه جابر العلوانی،مکتبه الشروق الدولیة،قاھرہ،۲۰۰٦ء،ص:۱٦۵

۱۰۔ التفسیر الکبیر ——فخر الدین الرازی، دار الفکر و الطباعة و النشر، بیروت،۱۹۸۱،ج:۲۵،ص:۱۱۱

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ التبر المسبوک فی نصیحة الملوک ——ابوحامد الغزالی، دار الکتب العلمیة، بیروت ، ۱۹۸۸ء،ص:۱۳۰-۱۳۱

۱۳۔ فقه القرآن ——عمر احمد عثمانی،ادارہ فکر اسلامی،کراچی(ج:۳)ص:۲۳۷-۲۳۸(بحوالہ اکمل الدین البابرتی، العنایة شرح ھدایة برحاشیہ فتح القدیر،ج:٦،ص:۸

۱۴۔ اس پر نسبتاً ایک تفصیلی اور تحقیقی مقالے کے لیے دیکھیے :اشکالیة نقصان عقل المراۃ و دینھا: دراسة حدیثیة فکریة، وحدة الامة ——محمد ابواللیث الخیر آبادی،اگست۲۰۱۴ء

۱۵۔ امداد الفتاویٰ-مولانا اشرف علی تھانوی، مکتبہ دارالعلوم، کراچی، ۲۰۲۰ء، ص:۱۰۳-۱۰۵

۱۶۔ من فقه الدولة فی الاسلام، ص:۱۷۶

۱۷۔ بخاری، رقم الحدیث، ۴۴۲۵

۱۸۔ من فقه الدولة فی الاسلام، ص:۱۷۴

۱۹۔ مواطنون لاذمیون — فہمی ہویدی، دارالشرق، قاہرہ، ۱۹۹۵ء، ص:۱۲۵

۲۰۔ نحن والآخر، دراسة فقهية تاصيلية — محی الدین القرہ داغی، الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین لجنة التالیف والترجمة، دوحة، بدون سن، ص:۹۵

۲۱۔ حقوق غیر المسلمین فی الدولة الاسلامیة — علی بن عبدالرحمٰن الطیار، ناشر: مصنف، الریاض، ص:۱۶۱

22. Mohammad Iqbal, Dr, The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Landon, Oxford University Press, 1934,p.92

سید خالد جامعی*

مغربی فکر و فلسفہ
فہم و تنقید کے زاویے

مغربی فکر و تہذیب کی تفہیم کے لیے مطالعہ ناگزیر ہے، لیکن اسے سمجھنے کے لیے کیا پڑھا جائے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ان حقائق کے شعور کے لیے کم از کم دو سو اردو اور انگریزی کتب کا مطالعہ ناگزیر ہے، ممکن ہے یہ تعداد بہت زیادہ محسوس ہو لیکن ان کتابوں کا مطالعہ کیے بغیر شاید ہم مغرب کے بطن میں مضمر کفر کو نہ سمجھ سکیں، یہ فہرست اب بھی مختصر ہے، اس لیے کہ مغرب کو سمجھنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے، تہذیبوں کے تصادم، مغربی فکر و فلسفے کے ادراک، تفہیم و تسہیل، سرمایہ داری اور عیسائیت کی تاریخ اور یونانی فلسفہ و سائنس کے عیسائیت پر مرتب ہونے والے اثرات کو سمجھنے کے لیے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ سود مند رہے گا:

۱۔ **تہافت الفلاسفۃ** : از امام غزالی (۱۰۵۸-۱۱۱۱ء) یہ اسلامی اور مذہبی فکر کے تصادم کے بارے میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی کتاب ہے، کلاسیکی یونانی فلسفہ تراجم کے ذریعے مسلم مفکرین پر گہرے اثرات مرتب کر رہا تھا، تہافۃ الفلاسفۃ میں فارابی اور ابن سینا کے فلسفوں اور ان کی فکر کے بنیادی نکات کا جواب دیا گیا ہے، غزالی نے یونان کے زیر اثر

* ماہ نامہ معارف، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یو پی)

مسلم فلسفیوں کی فکر کو بیس بنیادی مسائل میں ڈھالا اوران کا جواب لکھا۔

۲۔ **تھافت التھافت**: از ابن رشد(۱۱۹۸-۱۱۲۶ء) یہ کتاب امام غزالی کی تہافتہ الفلاسفہ کا جواب ہے۔(امام غزالی کے انتقال کے بعد شائع ہوئی) تہذیبی فکر کے تصادم سے دلچسپی رکھنے والے اگر یہ دیکھنا چاہیں کہ یونانی فکر کا حملہ کتنا شدید تھا اورامام غزالی نے تہافتہ میں اس کا کیا جواب دیا اور تہافتہ پر تنقید کرنے والوں نے غزالی پر کیا نقد فرمایا؟ اس نقد کی سطح کیا تھی؟ یہ کتاب امام غزالی کے فکر پر تمام نقد کا احاطہ کرتی ہے، اس لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

۳۔ **الرد علی المنطقیین**: از علامہ ابن تیمیہ، اس کتاب میں امام ابن تیمیہ نے یونانی فکر کے مسلم فکر پر اثرات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، مسلم مفکرین کے یہاں یونانی اثرات کی نشاندہی کی ہے اور یونانی فکر کا رد کیا ہے۔

۴۔ مکتوبات امام ربانی: (کامل) از مجدد الف ثانی، یہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کا مجموعہ ہے، ان مکتوبات میں اسلامی عقائد کا بیان ہے اور کئی خطوط میں اسلامی اور غیر اسلامی عقائد کے امتیازات اور اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی تہذیبوں کی عدم مطابقت کے بنیادی امور بیان کیےگئے ہیں۔

۵۔ **الرسالة الحمیدیة**: از شیخ آفندی

۶۔ **الانتباھات المفیدۃ فی الاشتباھات الجدیدۃ**: از حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، اس کا انگریزی ترجمہ محمد حسن عسکری نے An Answer to Modernism کے نام سے کیا ہے۔

۷۔ عقلیات اسلام: از مولانا مصطفیٰ خان بجنوری، یہ کتاب الانتباہات کی تسہیل وتشریح ہے، اصل رسالہ ستر صفحات پر مشتمل ہے اور تشریح چھے سو صفحات کی ہے، رسالہ انتباہات کی تسہیل و تشریح نہایت عمدہ طریقے سے کی گئی ہے اور عقل و منطق کی نارسائیاں نہایت عمدہ دلیلوں سے واضح کی گئی ہیں، اندازِ بیان سادہ اور دل نشیں ہے اگر اس کتاب کو غور سے پڑھا جائے تو جدید سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کے غبار سے چندھیانے والی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں،

عرصہ سے اس کتاب کی اعلیٰ طباعت پر کسی نے خاص توجہ نہیں دی تھی البتہ اب مکتبۃ البشریٰ کراچی نے اعلیٰ طباعت سے آراستہ کر کے شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

۸۔ **الکلمة الملھمة**: از اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی۔

۹۔ **کلیات اکبر الہ آبادی**: اکبر الہ آبادی ہمارے عظیم ترین شاعروں میں سے ہیں، تہذیبوں کے تصادم کے ابتدائی مراحل دیکھنے ہوں تو اکبر کی شاعری پڑھنا ناگزیز ہے، اکبر کی عظمت یہ ہے کہ اقبال تک ان کے زیرِاثر رہے ہیں، اکبر کی تخلیقی سطح اقبال کے ہم پلہ ہے، فرق یہ ہے کہ اکبر نے جو بات طنز و مزاح کے پیرائے میں کہی ہے اقبال اسے ایک بڑے فکری کینوس میں اعلیٰ ترین سنجیدہ سطح پر بیان کرتے ہیں، کلیات اکبر الہ آبادی کے مطالعے کی تجویز ممکن ہے بعض طبائع پر گراں گزرے لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ اکبر الہ آبادی نے طنزیہ شاعری کے ذریعے تہذیب و فلسفہ مغرب کے خلاف بند باندھنے کی کتنی زبردست کوشش کی، ان کے اس کام کی اہمیت شاعر مشرق پر خوب روشن تھی اسی لیے علامہ اقبال اپنے خطوط میں حضرت اکبر کو اپنا پیر قرار دیتے، ان کا شرف نیاز حاصل کرنا چاہتے اور اپنا دل حضرت اکبر کے سامنے چیر کر رکھنا چاہتے تھے، اقبال خود کو لاہور میں تنہاء سمجھتے اور حضرت اکبر کو وہ فرد واحد جانتے جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے، وہ اکبر سے طویل خط لکھنے کی استدعا کرتے اور اس خواہش کو روحانی خودغرضی قرار دیتے، وہ حضرت اکبر کو پیر مشرق قرار دیتے تھے، حضرت اکبر کے بارے میں اقبال نے یہاں تک لکھا: ''اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا قطعاً رنج نہیں بلکہ خوشی ہے، خط و کتابت سے پہلے آپ سے جو ارادت و عقیدت تھی ویسی اب بھی ہے اور ان شاء اللہ جب تک زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی''۔ اقبال نے چند اشعار حضرت اکبر کے رنگ میں بھی لکھے مگر عوام کی بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ سے کچھ سمجھ لیا، اقبال کے خیال میں حضرت اکبر نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرہ (شعر) میں بند کر دیا تھا، واضح رہے کہ اقبال ہیگل کو بہ اعتبار تخیل افلاطون سے بڑا فلسفی تصور کرتے تھے، حضرت اکبر کے خطوط سے اقبال پر غور و فکر کی راہیں کھلتیں اس لیے اکبر کے خطوط وہ محفوظ رکھتے، حضرت اکبر کے اشعار پڑھ کر اقبال کو

شیکسپئر اور مولانا روم یاد آجاتے تھے، اقبال شکوہ جواب شکوہ پر دس پندرہ سطور کا دیباچہ ناشر کے مطالبے پر حضرت اکبر سے لکھوانے کے خواہش مند تھے (اقبال نامہ ، ص:۳۷۲،۳۷۴،۳۷۶،۳۷۷،۳۷۸،۳۹۳،۳۹۷، یک جلدی تصحیح وترمیم شدہ، اقبال اکادمی پاکستان ۲۰۰۵) علامہ اقبال کے اِن افکار سے ''کلیات اکبرالہ آبادی'' کی اہمیت بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔

۱۰۔ اقبال کی ساری اردو اور فارسی شاعری اور کم از کم ''ضربِ کلیم'' جو اس اعلان کے ساتھ شائع ہوئی ''ضربِ کلیم یعنی اعلان جنگ'' دورِ حاضر کے خلاف خطباتِ اقبال سے اقبال نے رجوع کرلیا تھا لہٰذا اس کا ذکر نہیں کیا گیا، اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی کے افکار جو خطبات پر عالمانہ نقد ہیں، جریدہ شمارہ:۳۳، میں بنام ''امالی غلام محمد'' کے نام سے ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

۱۱۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی: از مولانا مودودی

۱۲۔ انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل: از مولانا مودودی

۱۳۔ تفہیمات: از مولانا مودودی

۱۴۔ تنقیحات: از مولانا مودودی

۱۵۔ الجہاد فی الاسلام: از مولانا مودودی

۱۶۔ رسائل ومسائل: (پانچ حصے) از مولانا مودودی، ان میں عہد حاضر کے متکلمانہ مسائل کا انتخاب نظر آئے گا اور جدید ذہن کے شبہات سامنے آئیں گے۔

۱۷۔ مغربی فکر وفلسفے کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، خطبات لاہور: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

18. A Cas Against Capitalism: Dr Javaid Akber Ansari

19. Buisness Ethices in Pakistan: Dr Javaid Akber Ansari

20. Money and Banking in Pakistan: Dr Javaid Akber Ansari

21. Financial Menagement in Pakistan: Dr Javaid Akber Ansari

۲۲۔ قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل: از ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، اس کتاب کا آخری باب ''جدید اسلامی فکر میں اقبال کی اہمیت'' ص:۲۱۵ تا ۲۹۲ پر محیط ہے، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

صاحب کا انگریزی میں غیر مطبوعہ مقالہ:'Iqbal's Reconstruction' بھی اہمیت کا حامل ہے، فاروقی صاحب کے شاگرد خضر یاسین کی تحقیق کے مطابق خطبات پر علامہ سید سلیمان ندوی کی تنقید اور برہان فاروقی کی غیر مطبوعہ انگریزی کتاب کے الفاظ، خیالات اور افکار میں غیر معمولی توارد ہے، اس سلسلے میں جریدہ ۳۴ اور اقبال اکادمی کی کتاب ''میارا بزم برساحل کہ آنجا'' کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔

۲۳۔ خطبات اقبال نئے تناظر میں: از محمد سہیل عمر، علامہ اقبال مرحوم کے خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کا پہلا فلسفیانہ ناقدانہ جائزہ ہے، اس کتاب کے ذریعے فکر و فلسفہ و تہذیب مغرب کے پیدا کردہ الحاد، شکوک، شبہات، سوالات، اعتراضات اور واہمات کی مکمل تصویر سامنے آتی ہے، عہد جدید کے اذہان میں پیدا شدہ ان سوالات کا جواب عقلیات کی روشنی میں دینے کی کوشش مختلف مفکرین اور متجددین نے کی ہے، اس کا ناقدانہ جائزہ بھی سامنے آتا ہے، محمد سہیل عمر صاحب نے اس کتاب کو برہان احمد فاروقی صاحب کے امالی قرار دیا ہے جبکہ یہ محض اظہار عجز ہے اور محمد سہیل عمر صاحب کی سعادت مندی اور احسان شناسی۔

24. History of Islamic Philosophy: Dr Syed Hussein Nasr

حسین نصر کی تمام کتابیں اہمیت کی حامل ہیں، ان کے فکر سے ہمیں اختلاف ہے لیکن ان میں بہت اہم نکتے ملتے ہیں۔

۲۵۔ خطبات اقبال ایک مطالعہ: ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی، اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ علوم اسلامی کی باقاعدہ تحصیل اور عربی زبان پر عبور کے بغیر اجتہاد اور روشن خیال افکار پیش کرنے کے دعویدار کس قدر اغلاط کرتے ہیں اور قدم قدم پر ٹھوکر کھاتے ہیں۔

۲۶۔ قرآن اور علم جدید: ڈاکٹر رفیع الدین، ڈاکٹر صاحب کی دیگر کتابوں میں بھی کام کے نکتے ملتے ہیں۔

۲۷۔ مائیکل مین کی معرکہ آراء کتاب The Dark Side of Democracy یہ کتاب جمہوریت کے اصل چہرے سے نقاب الٹتی ہے اور تاریخی اعداد وشمار سے ثابت کرتی ہے کہ

جمہوریت جہاں بھی گئی قتل و غارت گری لے کر گئی اور بیسویں صدی دنیا کی خوں خوار ترین صدی تھی، مائیکل مین نے اعداد و شمار اور حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ اسلام تمام مذاہب میں سب سے زیادہ پر امن مذہب ہے اور اس کی تاریخ اجلی تاریخ ہے۔ جمہوریت کے تمام مداحوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ لازمی ہے۔ اگر مداحان جمہوریت کی نظر سے یہ کتاب گزر جائے تو شاید وہ جمہوریت ترک کر دیں، جمہوریت نے جس طرح خوں ریزی کی اور ایک ارب انسانوں کا قتل عام کیا، ہمارے اکثر دانشور اس کی تاریخ سے ناواقف ہیں۔

۲۸۔ مریم جمیلہ صاحبہ کی تمام کتابیں خصوصاً ''اسلام ایک نظریہ ایک تحریک'' اور Islam and Modrenism مریم جمیلہ صاحبہ کے وہ تمام تبصرے جو مختلف کتابوں پر وہ Muslim World Book Review میں سالہا سال تک کرتی رہیں۔

۲۹۔ جدیدیت: یعنی مغربی فکر کی گمراہیوں کا خاکہ از محمد حسن عسکری۔ ''جدیدیت'' مغربی فکر کے زوال اور اس کے ہولناک اثرات کی مختصر ترین تاریخ ہے۔

۳۰۔ وقت کی راگنی: از محمد حسن عسکری ''وقت کی راگنی'' ہمیں بتاتی ہے کہ اردو ادب کی روایت کیا ہے؟ اور وہ مغربی روایت سے کتنی مختلف ہے؟

محمد حسن عسکری کے مندرجہ ذیل مضامین وانٹرویو وغیرہ کا مطالعہ بھی از حد مفید رہے گا۔

- مذہبی شاعری، یہ گفتگو ''لفظ'' میں شائع ہوئی تھی
- ''محراب اور سات رنگ'' میں شائع شدہ مضامین
- محسن کاکوروی کی نعت
- پیروی مغرب کا انجام
- اردو کی ادبی روایت کیا ہے؟
- بارے آموں کا کچھ بیان ہو جائے
- جزیرے کا دیباچہ
- روح کی تلاش
- ادب میں اخلاقی مطابقت

- ❑ ہمارا ادبی شعور اور مسلمان
- ❑ اسلامی فن تعمیر کی روح
- ❑ مغرب میں مسلمانوں کے تبلیغی وجود
- ❑ مکاتیب عسکری مرتبہ شیما مجید
- ❑ مضامین عسکری شیما مجید
- ❑ مشرق ومغرب کی آویزش اردو ادب میں
- ❑ شب خون میں احمد جاوید اور آصف فرخی کا مکالمہ نیز شب خون البلاغ میں عسکری کے مضامین

۳۱۔ نئی نظم اور پورا آدمی: از سلیم احمد، ’’نئی نظم اور پورا آدمی‘‘ اردو تنقید کی نہایت ہنگامہ خیز اور اہم کتابوں میں سے ہے، یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ مغربی فکر وفلسفے کے زیر اثر ہمارے ادب سے کس طرح پورے آدمی یا Whole Man کا بیان تحلیل ہوا اور اس کی جگہ ادھورے آدمی کا بیان در آیا، سراج منیر نے سلیم احمد کے تصور کو مابعد الطبیعاتی سطح کا نظریہ قرار دیا ہے۔

۳۲۔ مشرق ہار گیا از سلیم احمد

مشرق سلیم احمد کی ایک طویل نظم ہے جس میں مغربی فکر کے زیر اثر مسلم معاشروں میں اقدار کی شکست وریخت اور علامتوں کی تبدیلی کو بیان کیا گیا ہے۔

۳۳۔ معرکہ مذہب وسائنس: ترجمہ مولانا ظفر علی خان

۳۴۔ سائنس اور مذہب: عبد الباری ندوی

۳۵۔ صدق اور صدق جدید: مولانا عبد الماجد دریابادی کے تمام رسالے، ہر رسالے میں کوئی نہ کوئی نکتہ مل جاتا ہے جس سے مغربی فکر وفلسفے کی تردید ہوتی ہے

36. M M Sharif, A History of Muslim Philosophy

۳۷۔ عالم اسلام دجالی تہذیب کی زد میں، عبد الماجد دریابادی: مرتب حافظ محمد موسیٰ بھٹو

۳۸۔ ملت اسلامیہ اور عصر حاضر کے تقاضے، عبد الماجد دریابادی: مرتب حافظ محمد موسیٰ بھٹو

۳۹۔ اسلام، مسلمان اور تہذیب جدید، عبد الماجد دریابادی: مرتب حافظ محمد موسیٰ بھٹو

۴۰۔ بیسویں صدی کے اسلامیت کے ممتاز شارحین، محمد موسیٰ بھٹو

۴۱۔ تعلیمات مجدد الف ثانی، محمد موسیٰ بھٹو
حافظ محمد موسیٰ بھٹو ماہنامہ ''بیداری'' بھی شائع کرتے ہیں، یہ رسالہ مختلف النوع مضامین کا گلدستہ ہے، اس میں مغرب، فکر مغرب، فلسفہ مغرب پر شائع شدہ مضامین، کتابیں اور تقاریر کا خوبصورت انتخاب پیش کیا جاتا ہے (بعض مضامین جدیدیت کی تائید بھی کرتے ہیں کیونکہ مضمون نگار علماء اور مفکر مغربی فکر و فلسفے سے واقف نہیں ہوتے لہٰذا سادہ لوحی کے باعث اخلاص سے مغرب اور جدیدیت کے بعض مظاہر کی اسلامی توثیق کر دیتے ہیں لیکن ایسا شاذ ہوتا ہے۔)

۴۲۔ سرسید اور حالی کا نظریۂ فطرت: از ڈاکٹر ظفر الحسن، یہ کتاب بتاتی ہے کہ برعظیم پاک و ہند میں سرسید احمد خان اور مولانا حالی نے کس طرح مغربی تہذیب کی اصطلاح Nature کو غلط سمجھا اور اس کا اطلاق ادب کے ساتھ اسلام پر بھی کر ڈالا جس کے تباہ کن فکری نتائج برآمد ہوئے، یہ کتاب بتاتی ہے کہ لفظ ''نیچر'' عیسائی، ہندو، جدید مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب میں کن کن معنوں میں استعمال ہوا اور ان معنوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس موضوع پر اس سے زیادہ اچھی کتاب شاید ہی کبھی لکھی گئی ہو۔

۴۳۔ افکار سرسید: از ضیاء الدین لاہوری

۴۴۔ حیات سرسید: از ضیاء الدین لاہوری

۴۵۔ نقش سرسید: از ضیاء الدین لاہوری
یہ کتابیں ضیاء الدین لاہوری صاحب کی چالیس سالہ تحقیقی کاوشوں کا حاصل ہیں، ان کتابوں میں مصنف نے موضوعات کے اعتبار سے سرسید کی فکر کو ان کی اصل تحریروں سے اقتباسات کی صورت میں جمع کر دیا ہے اور ہر کتاب میں سرسید کی فکر کا نچوڑ سمٹ آیا ہے، واضح رہے کہ برعظیم پاک و ہند میں جدیدیت کے بانی سرسید ہیں (گو کہ اس کا آغاز کرامت علی جونپوری سے ہوا) لہٰذا سرسید کی فکر کو اس کے سیاق و سباق بلکہ سرسید کے اصل الفاظ میں پڑھنا نہایت ضروری ہے، سرسید کے اثرات کا اپنے عہد کے بڑے بڑے لوگوں پر اثر تھا، بڑے بڑے نامی گرامی شخصیات تک سرسید کے اثرات سے بچ نہ سکے اور ان کے

افکار میں جدیدیت کا زہر سرسید کی تعلیمات کا اثر ہے، اس وقت سرسید کی تمام تحریریں ان بزرگوں کے سامنے نہیں تھیں، خصوصاً سرسید کا وہ خط جس میں وہ قرآن کو کلام اللہ نہیں بلکہ کلام رسول اللہ قرار دیتے ہیں، یہ جرأت اسلامی تاریخ میں خوارج، معتزلہ اور کسی گمراہ فرقے کو بھی نہ ہوئی اگر یہ خط ان اکابرین کے سامنے ہوتا تو وہ سرسید کو رد کر دیتے۔

۴۶۔ ایران سے شائع ہونے والا سہ ماہی رسالہ Echo of Islam (Thought)، مدیر محمد سلیمی۔

47. The Decline of the West by Oswald Spengler

مغربی تہذیب کے بارے میں اس کتاب کا شمار مغربی ادب کے کلاسک میں ہوتا ہے، یہ کتاب پہلی جنگ عظیم سے قبل لکھ لی گئی تھی مگر شائع ۱۹۲۶ء میں ہوئی، یہ کتاب مغربی تہذیب کی بنیادوں، کلاسکی یونانی فکر اور مغربی تہذیب کے مرحلہ بہ مرحلہ زوال کو بیان کرتی ہے، اسے پڑھے بغیر مغربی فکر کے بحران کا اندازہ دشوار ہے، اس کا ترجمہ ''زوال مغرب'' کے نام سے اکادمی ادبیات شائع کر چکی ہے۔

۴۸۔ رینے گینوں کی تین اہم کتابیں:

1. The Reign of the Quantity
2. Crisis of the Modern World
3. East and West

رینے اسلام لانے کے بعد شیخ عبدالواحد عیسیٰ کہلائے، ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے قبل رینے کے فکر کا جائزہ جریدہ ۳۵ میں ملاحظہ کیجئے کیونکہ روایت کا مکتب فکر وحدت ادیان کی گمراہی کا مبلغ ہے، احمد جاوید اور تحسین فراقی نے لاہور میں مارٹن لنگز سے براہ راست پوچھا کہ آپ روایت کی جو بات کرتے ہیں تو کیا اس کا مطلب یہی ہے کہ تمام مذاہب برحق ہیں اور کوئی حق نہیں؟ تو مارٹن لنگز نے برجستہ جواب دیا جی ہاں! آپ بالکل درست سمجھے ہیں۔ (یہ روایت تحسین فراقی صاحب نے راقم [سید خالد جامعی] سے خود بیان کی)

۴۹۔ رینے کے معاصر آنند کمار سوامی کی دو کتابیں:

1. Figure of Speech or Figure of Thought

2. What is Civilization

دوسری کتاب بتاتی ہے کہ مذہبی تہذیبوں میں لفظ تہذیب کے کیا معنی رہے ہیں اور جدید مغربی تہذیب اسے کس مفہوم میں استعمال کرتی ہے؟ پہلی کتاب ثابت کرتی ہے کہ جدید مغربی فکر آرٹ اور تخلیق کے تصور کو پست سے پست تر کر کے اس سطح پر لے آتی ہے جہاں انسان، حیوان اور پودوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔

۵۰۔ Frithjof Schuon کی درج ذیل کتابیں: شواں کا تعلق بھی روایت کے گمراہ مکتب فکر سے ہے۔

1. Dimensions of Islam
2. To Have a Center

فکر کو سمجھنے کے لیے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ لازمی ہے۔

51. Judaism and Rise of Capitalism, ZAMBAT
52. Sources of Self Charles, Taylor
53. I & Thou Martin Boober
54. Being and Nothingness, Sarter
55. Capitalism Shezophrenic life style, Dlues
    Anti Edipus [Volume I]
    Anti Platious [Volume II]
56. Madness & Civilization, Focualt
57. Dicipline and punishment, Focualt
58. History of Sexuality (Three Volumes), Focualt
59. The Archiology of Knowledge, Focualt
60. The Birth of Clinic, Focualt
61. Contigency Irony and solidarity, Richard Rorty
62. Achieving our country, Richard Rorty
63. Objectivity Vol. I & II, Richard Rorty
64. Post Structurallism and Post modernism, Madhan Surup
65. Enlightenment Wake, John Gray.

66. History of Muslim Thought, Majid Fakhri
67. Philosophy and Islam, M. Watt
68. Islam. A. R Gibbs
69. Platuo, A.E. Taijlor
70. An introduction of Greek Thoghts, Guttehery
71. An introduction of Greek Thoughts, STAC
72. The Classics of westren philosophy, [1 volume]
73. Being & Existence

بروک (Broke) کی اس کتاب کا دیباچہ ہائی ڈیگر نے لکھا ہے، یہ کتاب Being & Time کی شرح ہے اور اتنی عمدہ شرح کہ ہائیڈیگر نے دیباچے میں لکھا کہ میرے خیال کے قریب کتاب ہے۔

مغربی مصنفین ومفکرین کی درج ذیل کتابوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے

75. The rise and fall of the great powers. By Paul Kennedy
76. The end of the history and the last man by Fukuyama
77. The world in collision edited by Ken Booth and Tim Dunne
78. Holy war by Karen Arms Strong
79. The anatomy of human destructiveness by Eric Fromm
80. Muslims and the west. Editors. Ansari Zaffer Ishaq and John Esposito

فکر وفلسفہ وتہذیب مغرب کا رعب عموماً سائنس وٹیکنالوجی کے ذریعے بٹھایا جاتا ہے، جدیدیت پسند مفکرین مغرب کی سائنس وٹیکنالوجی سے بے حد مرعوب ہیں اور اس کا کوئی متبادل نہیں پاتے سوائے اس کے کہ عالم اسلام کسی بھی طریقے سے مغرب کی اس ترقی کو حاصل کرے، ان مفکرین کو سائنس وٹیکنالوجی کے مباحث سے متعلق درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ ان کا خلجان دور ہو سکے اور امت ان کے افکار کی اڑائی گئی گرد سے باہر نکل سکے، یہ کتابیں ان لوگوں کیلئے بھی مفید ہیں جو ابھی تک سائنس اور ٹیکنالوجی کے سحر

سے باہر نہیں آسکے اور امت مسلمہ کی نجات، فلاح اور فوز کا تصور سائنس کے بغیر کرنے سے عاجز ہیں، مدارس عربیہ کے طلباء اور علماء کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ بہت سے اشکالات دور کردے گا اور مغرب کے مقابلے میں انھیں اعتماد و یقین عطا کرے گا، اس دور کا المیہ یہ ہے کہ ہم مغرب کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو اعتماد و یقین کی دولت سے محرومی بھی ہمارے ساتھ ہوتی ہے، ہم اندر سے خائف ہیں اور اپنے خوف کو صرف خطابت سے چھپاتے ہیں، ہمیں یقین کی ضرورت ہے، ایسا پختہ یقین جو اس ایمان سے پھوٹے کہ مغرب باطل ہے، اسلام حق ہے اس کے بعد یقین کی علمی بنیادیں تلاش کی جائیں لیکن یقین علم سے مشروط نہیں ایمان سے مشروط ہے۔

81. Discourse on Method and the Meditations by Rene Descartes, translated by F. E. Sutcliffe
82. Crises of European Sciences by Edward Husserl. Mathematical Principles of Natural Philosophy.
83. Science A History, by John Gribbin
84. Newton to Einstein by Ralph Baicelain.
85. A History of Science by William Dampier
86. Galileo at Work by Stillman Drake
87. Issac Newton by Rupert Hall
88. Nicholas Copernicus by Josef Rednicbi.
89. The Scientific Work of Rene Descartes by J. F. Scott.
90. The Scientific Revolution by Steven Shapin
91. Science and the Modern World by A. N. Whitehead
92. Foresight and understanding by Stephen Toulmin
93. Philosophy of Science by Alexendar Bird
94. What is this thing called science by A. F. Chalmer
95. Between Science and Metaphysics by S. Amsterdamski
96. Belief, Truth and Knowledge by D. M. Armstrong
97. Truth and Logic by A. J Ayer

98. Two Paradigms of Scientific Knowledge by D. Bloor
99. The Natural Philosophy of Galileo by Maurice Clavelin
100. Feyerabends Discourse against Method by J. Curfhoys and W. Suchting
101. On Scientific Method by J. J. Daires
102. How to defend Society against science by P. K. Fayerabend
103. Two New Sciences by Galileo Galilei
104. Philosophy of Natural Science by C. G. Hampel
105. Treatise on Human Nature by D. Hume.
106. Metaphysics and Measurement by A. Koyre
107. The structure of Scientific Revolution by T. Kohn.
108. Proofs and Refutation by Z. Lakatos
109. The logic of Scientific Discovery by Karl Popper.
110. Science and Subjectivity by Israel Scheffler
۱۱۱۔ جمال پانی پتی کی کتاب ''جدیدیت کی ابلیسیت''
۱۱۲۔ ادبی رسالہ ''مکالمہ'' کے متفرق شمارے جن میں جدیدیت پر جمال پانی پتی اور دیگر مفکرین کے قیمتی مضامین مل جاتے ہیں، مکالمہ جناب مبین مرزا کی زیرادارت شائع ہوتا ہے اور جدیدیت کا سخت ناقد لیکن نہایت علمی وتحقیقی وادبی رسالہ ہے۔
۱۱۳۔ ضمیرعلی بدایونی کی کتاب ''جدیدیت اور پس جدیدیت''
۱۱۴۔ جریدہ ''روایت وتہذیب'' اور جریدہ ''روایت'' کے چھے شمارے جو سہیل عمر اور سراج منیر کی زیرِادارت شائع ہوئے، ان میں بعض مضامین نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔
۱۱۵۔ جریدہ ''اعلام'' (لاہور) شمارہ:۳ جس میں محمد حسن عسکری کی کتاب ''مغربی فکر کی گمراہیوں کا خاکہ'' پر جناب ڈاکٹر ساجد علی نے ''محمد حسن عسکری کا تصورروایت ومابعدالطبیعات'' کے نام سے نہایت عالمانہ نقد کیا ہے۔
۱۱۶۔ ماہنامہ فنون میں محمد عسکری کی کتاب ''جدیدیت'' اور اس کے متعلقات پر محمد ارشاد کے

ناقدانہ مضامین بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۱۷۔ غرب زدگی (فارسی) جلال آل احمد تہران، انقلاب ایران کے زمانے کی مقبول ترین کتاب۔

۱۱۸۔ ڈاکٹر علی محمد رضوی کا ایم فل کا مقالہ۔

1. Focault on Freedom

2. Methodology underlying Imam Ghazali's critique of Greek Philosphy. مطبوعہ جریدہ:۲۹

۱۱۹۔ ڈاکٹر عبدالوہاب سوری کا پی ایچ ڈی مقالہ

Philosophical Analysis of Rawl's Theory of Justice

مطبوعہ جریدہ:۳۴

۱۲۰۔ **الفکر الاسلامی الحدیث وصلتُه بالاستعمار الغربی: الدکتور محمد البهی**

۱۲۱۔ شاہنواز فاروقی کے کالموں کا مجموعہ ''کاغذ کے سپاہی'' اور ایم اے کے لیے لکھا گیا تحقیقی مقالہ ''سلیم 0 احمد'' مغربی فکر و فلسفے کے بہت سے پہلوؤں کو بے نقاب کرتا ہے، ''سلیم احمد'' والے مقالے میں تہذیب مغرب کی کش مکش سے ابھرنے والے بے شمار سوالات پر غور وفکر کا موقع میسر آتا ہے۔

۱۲۲۔ **قصة الایمان بین الفلسفة و علم القرآن: مفتی طرابلس الشیخ ندیم الجسر.**

۱۲۳۔ ہائی ڈیگر کی درج ذیل کتابیں:

1. Being & Time

2. Question Concerning Technology

۱۲۴۔ اسلام، پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر: ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی

۱۲۵۔ ارکان اربعہ: ابوالحسن علی ندوی

۱۲۶۔ تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب: ابوالحسن علی ندوی

۱۲۷۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ جامعہ پنجاب، اس انسائیکلو پیڈیا میں مسلم فلاسفہ اوران کے افکارو نظریات کے سلسلے میں اہم معلومات مل جاتی ہیں۔

۱۲۸۔ معتزلہ کی تاریخ وزہدی حسن جاراللہ کا پیش لفظ الفرڈ گیوم

۱۲۹۔ الملل والنحل: ابن حزم اندلسی، ترجمہ عبداللہ العمادی

۱۳۰۔ الملل والنحل: شہرستانی ترجمہ پروفیسر علی محسن صدیقی

۱۳۱۔ الفرق بین الفرق: عبدالقاہر بغدادی

۱۳۲۔ العقل والنقل: علامہ شبیر احمد عثمانی

۱۳۳۔ قرآن حکیم کے وہ تمام متداول تراجم اور تفاسیر جوامت مسلمہ کے مسلمہ مکاتب فکر کے ہاں رائج ہے۔

۱۳۴ ٹونی کی کتاب

Religion and Rise of Capitalism

۱۳۵۔ میکس ویبر کی کتاب

Capitalism and Protestant Ethics

۱۳۶ بیرنگٹن مور کی کتاب

Social Organs of Dictatorship and Democracy Lord and Peasent in the Making of Modren World.

۱۳۷۔ رکسانہ لیوبن کی کتاب

Enemy in the mirror

۱۳۸۔ ڈاکٹر ڈیوڈ میکے کی کتاب

Critique of Modernity

۱۳۹۔ جرگین ہیبر ماس کی کتاب

The Philosophical Discourse of Modernity

۱۴۰۔ مغربی فکر وفلسفے کے التہاب والحاد سے پیدا ہونے والے اضطراب نے عالم اسلام کے

مفکرین کو کس طرح متاثر کیا؟ اور بڑے بڑے علماء وفضلاء کس طرح جدیدیت میں ڈوب گئے اور مغرب کی چکاچوند میں بہہ گئے؟ اس کا جائزہ بھی ضروری ہے اس سلسلے میں نیاز فتح پوری، علامہ مشرقی، غلام احمد پرویز، سر سید احمد خان، غلام جیلانی برق کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے، جس سے مغربی یلغار کے اثرات کا اندازہ ہوگا، مغرب سے علمی سطح پر متاثر ہونے والے افراد کے تشکک اور تذبذب کا گہرا جائزہ لینے کے لیے علامہ اقبال، احمد سعید اکبر آبادی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن (سابق سربراہ ادارہ تحقیقات اسلامی) اور ڈاکٹر منظور احمد (سابق ریکٹر اسلامی یونیورسٹی) کی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے، اس مطالعے کے دوران یہ واضح ہو جائے گا کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن، ڈاکٹر منظور احمد، غلام احمد پرویز اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے تمام متجددین اور جدیدیت پسند علماء کی فکر علامہ اقبال کے خطبات کے اعادہ سے زیادہ نہیں ہے اور خطبات کی تشکیک پر اپنے فکر ونظر کی عمارت تعمیر کرنا ان تمام جدیدیت پسندوں کا طرہ امتیاز ہے اور تمام جدیدیت پسند مفکرین کی فکر عصر حاضر میں پیدا ہونے والے مسائل کو مذہب کے دائرے میں حل کرنیکا دعوی کرتی ہے اور اس عمل کے دوران یہ بھول جاتی ہے کہ دین اور اس کی تمام روایات دور از کار تاویلات کے نتیجے میں جدیدیت کی بھول بھلیوں میں نہ صرف گم ہو جاتی ہیں بلکہ اس طرح تحلیل ہوتی ہیں کہ اگلی نسل میں ان کا سراغ بھی نہیں ملتا، مفتی عبدہ کے شاگرد رشید رضا کی وہ تحریریں پڑھ لی جائیں جو طٰہٰ حسین جیسے بے شمار عبدہ کے شاگردوں کے الحاد کے رد عمل میں لکھی گئیں، اس ضمن میں علامہ اقبال کے خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' جاوید غامدی کی ''اسلام کیا ہے؟'' جو ان کے شاگرد ڈاکٹر محمد فاروق خان کے نام سے شائع ہوئی ہے، کا مطالعہ ضروری ہے (ڈاکٹر منظور احمد اور ڈاکٹر جاوید اقبال ان جدیدیت پسند دانشوروں میں شامل ہیں جو نہ عربی جانتے ہیں نہ فارسی، ان کے علمی افلاس کا عالم یہ ہے کہ ان کی کتابوں میں کسی عربی فارسی کتاب کا حوالہ نہیں ملتا، مگر دین پر اعتراضات میں یہ لوگ نہایت جری ہیں) عالم اسلام کا المیہ یہ ہے کہ علامہ اقبال سے لے کر جسٹس جاوید اقبال اور ڈاکٹر منظور احمد تک ایک بھی جدیدیت پسند مفکر نہ اسلامی علوم پر عبور رکھتا ہے نہ عربی زبان سے گہری واقفیت لیکن سب کو اجتہاد کا لپکا ہے۔

۱۴۱۔ اقبال شناسی: ڈاکٹر منظور احمد

۱۴۲۔ اسلام چند فکری مسائل: ڈاکٹر منظور احمد

۱۴۳۔ نیاز فتح پوری کی ''خدا اور تصور خدا'' (یہ نگار کا خدا نمبر ہے جو سرقہ کیا گیا تھا، اس سرقے کی تفصیل ماہنامہ ''الدعوۃ'' انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے شمارہ:۱۲، جلد: ۵ میں ملاحظہ کیجئے۔)

۱۴۴۔ مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، من و یزداں، یہ کتابیں ڈاکٹر منظور احمد کے الحادی منہاج میں نہایت اہمیت کی حامل ہیں اور ڈاکٹر صاحب نے ایک خطبے میں ان کتابوں کو جدید فکر اسلامی کی تشکیل میں اہم مقام دیا ہے۔

۱۴۵ عورتوں کے امتیازی مسائل اور قوانین، حکمتیں اور قواعد، حافظ صلاح الدین یوسف

۱۴۶۔ فکریات، ترجمہ و ترتیب تحسین فراقی

۱۴۷۔ مسلمان اور مغربی تعلیم پاک و ہند میں، پروفیسر سید محمد سلیم

۱۴۸۔ مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، پروفیسر سید محمد سلیم

۱۴۹۔ برصغیر پاک و ہند میں غیر ملکی زبانوں کے ماہر علماء، پروفیسر سید محمد سلیم

۱۵۰۔ اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، سید قطب

۱۵۱۔ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی کا ترجمان مجلّہ ''جریدہ'' کے درج ذیل شماروں کا مطالعہ بھی سودمند رہے گا:

جریدہ:۲۲، جریدہ:۲۳، جریدہ:۲۴، جریدہ، ۲۵، جریدہ:۲۸، جریدہ:۲۹، جریدہ:۳۰

جریدہ:۳۲، جریدہ:۳۳، جریدہ:۳۵، جریدہ:۳۶

۱۵۲۔ ماہنامہ ''ساحل'' کراچی کا خاص موضوع مغربی تہذیب، فلسفہ اور تاریخ کا ناقدانہ جائزہ ہے، اس کی تمام فائلیں سودمند رہیں گی۔

۱۵۳۔ اسلام اور جدید سائنس نئے تناظر میں: محمد ظفر اقبال

۱۵۴۔ اسلام اور جدیدیت کی کشمکش: محمد ظفر اقبال

ڈاکٹر علی محمد بٹ*
ڈاکٹر ارشاد احمد میر**

شاہ ولی اللہ کی قرآنی بصیرت

عصر حاضر میں اس کی اہمیت اور ضرورت

اٹھارہویں صدی کے اوائل میں جب شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے سرزمینِ ہندوستان میں آنکھیں کھولیں، اُس وقت یہاں کے مسلمان شدید سیاسی، سماجی اور دینی انحطاط کا شکار تھے۔ اسلامی طرزِ حیات بتدریج اپنی روح کھوتا جا رہا تھا۔ مغل دور کے آخری حکمرانوں میں دینی شعور کی کمی اور سیاسی ناپختگی نے مذہبی اقدار کو گہرا نقصان پہنچایا۔ بالخصوص اٹھارہویں صدی میں برسرِ اقتدار آنے والے بیشتر حکمران بصیرتِ سیاست سے محروم تھے؛ ان کی زندگی میں نہ حقیقی حکمرانی کا جوہر باقی رہا اور نہ دینداری کی جھلک۔ لہو ولعب اور دنیاوی رنگینیوں میں غرق ہونے کا طرزِ عمل اس حد تک عام ہو چکا تھا کہ گویا یہ ایک وبا کی صورت اختیار کر گیا تھا، جس کے تدارک کے لیے دور دور تک کوئی صاحبِ عزم اور علمبردارِ حق نظر نہیں آتا تھا۔ ایسے پُرآشوب اور مایوس کن حالات میں اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کا ظہور ہندوستان میں ہوا، اور طوائف الملوکی کے اس دور میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جیسی عظیم شخصیت نے جنم لیا۔ جب وہ شعور کی عمر کو پہنچے اور حالاتِ حاضرہ پر سنجیدگی سے غور کیا تو ان کے دل میں ایک گہری خلش پیدا ہوئی۔

* اسسٹنٹ پروفیسر ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی اونتی پورہ
** اسسٹنٹ پروفیسر ڈیپارٹمنٹ آف عربک لنگویج اینڈ لیٹریچر، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی اونتی پورہ

انھوں نے اس زوال کی بنیادی وجہ قرآنِ مجید سے دوری کو قرار دیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی اصلاح اور اسلام کے احیاء کا واحد راستہ قرآنی تعلیمات کی طرف رجوع ہے۔ چنانچہ انھوں نے عوام الناس تک قرآن کے پیغام کو پہنچانے کا عزمِ صمیم کیا۔

جس قدر علمی کام قرآنِ مجید پر ہوئے دنیا کی کسی اور کتاب پر نہیں ہوئے۔ اگر چہ یہ کتاب نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ۲۳ سال میں نازل ہوئی، مگر یہ پوری انسانیت کے لیے ہدایت ہے۔ اس کی ہر آیت علم کا خزانہ ہے اور جو بھی اس کو ایک بار پڑھتا ہے اس کی پیاس نہیں بجھتی ہے۔ اسی مقصد کے تحت علما نے اس کے تراجم لکھے، اگر چہ وقت کے ساتھ یہ علمی رفتار کمزور پڑ گئی۔

برصغیر میں علومُ القرآن کی خدمت میں شاہ ولی اللہؒ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ انھوں نے قرآنِ کریم کا فارسی ترجمہ کیا اور ترجمہ قرآن کے اصول وضوابط مرتب کیے۔ اس مقالے میں انہی قرآنی کاوشوں اور فکری منہج کا جائزہ لیا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کا یہ بنیادی تصور تھا کہ اقوام کا عروج وزوال براہِ راست ان کے تعلیمی معیار سے وابستہ ہوتا ہے۔ جس معاشرے میں علم وتعلیم کا دائرہ وسیع ہوتا ہے، وہاں معیارِ زندگی خود بہ خود بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ جب تک مسلمان علم کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنائے رہے، وہ دنیا کی اقوام میں ایک منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے عقائد بھی درست تھے اور معاشی ومعاشرتی زندگی میں بھی وہ اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے علم کو غیر معمولی اہمیت دی، حتیٰ کہ جنگی قیدیوں کی رہائی کو تعلیم کے ساتھ مشروط کیا گیا، اور علم سے کسی بھی قسم کی غفلت کو ناپسند کیا جاتا تھا۔ اس دور کے علما قرآنِ مجید کے ہر پہلو میں درک اور مہارت رکھتے تھے۔

تاریخی طور دیکھا جائے تو ابن عباسؓ سے لے کر ابن جریر طبریؒ اور ابن کثیرؒ کے علاوہ دوسرے علماءِ قرآن نے قرآنی پیغام اور اُس کے علوم کو فروغ دینے کے لیے بھرپور کوششیں کیں اور قرآنی تعلیمات کی میدانِ علم کے ہر شعبے پر چھاپ ڈالنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ علاوہ ازیں علامہ جلال الدین سیوطی نے **الاتقان فی علوم القرآن** جیسی جامع اور مستند تصنیف قلم بند کر کے علومِ قرآن کے ہر موضوع کو ایک سے زائد ابواب میں منقسم کر کے اُن کی تفصیل بیان کر دی ہے۔ اس تفصیل کی خاص بات یہ ہے کہ یہ زیادہ تر احادیث واقوالِ صحابہ وائمہ اور روایات پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح

دیگر علمائے قرآن نے اپنے اپنے مقدور کے مطابق خدمات سرانجام دیں لیکن اُن علماء کرام میں ہر لحاظ سے شاہ ولی اللہ منفرد اور ہر اعتبار سے بے نظیر مقام رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے قرآنی علوم کو ہندوستانی عوام کی زبان کے مطابق ترجمہ انجام دے کر ایک نیا باب قائم کیا۔ ترجمے کے ساتھ ساتھ انھوں نے وضاحت کے لیے اسلاف کے مرتب کردہ اصولوں سے فائدہ بھی اُٹھایا۔

برصغیر میں جتنے تراجم کئے گئے، خاص کر پچھلے دو تین صدیوں میں جتنے ترجمے اور اسلوب وجود میں آئے ان پر شاہ ولی اللہ کے اسلوب کا اثر نمایاں ہے۔ علوم القرآن کے سلسلے میں تمام مکاتب فکر شاہ ولی اللہ کے خوشہ چیں ہیں۔

اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ کی قرآنی فکر علمی ارتقاء کے لحاظ سے اعلیٰ اور تمام معاصرین سے بلند و پائیدار تھی۔ قرآنی تعلیم کو اپنی اصلی جہت میں سمجھنے اور من و عن اُسی انداز میں عام کرنے، اس کے فہم وشعور کے بنیادی اصول وضوابط مرتب کرنے اور اصول تفسیر مدون کرنے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ آپ نے اپنے ترجمے کے لیے روایتی طرز عمل کے ساتھ ساتھ معاصر وقت کی ضروریات کو ملحوظ رکھا ہے۔ تفسیر بالماثور کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی خدمات کا دائرہ انتہا درجے وسیع ہے۔ آپ کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ آپ نے فہم قرآن کی راہیں امت کے ہر طبقے کے لیے واضح کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ خدمت اس دور میں لی جب برصغیر تو کیا تقریباً پوری عجمی دنیا، جس میں برصغیر کے ہمسایہ ملک ترکستان، افغانستان اور بالخصوص ایران نے قرآن مجید خاص طبقہ کے لیے مختص کیا ہوا تھا۔ اس طبقے کا خیال تھا کہ قرآن کا مطالعہ، غور وفکر، تدبر اور فہم وتفہیم ایک درجن سے زیادہ علوم پر موقوف ہے لہٰذا اس کو عوام میں لانا سخت خطرناک، یہ خیال انتہائی نامناسب تھا۔[۱] جب مسلمانان ہند سیاسی اور فکری لحاظ سے کمزور پڑ گئے اور ایسا لگتا تھا کہ اصلاح کے دروازے مکمل طور بند ہو گئے اور اصلاح اُمت کا آفتاب لب دام کو پہنچ گیا، تو اس فکری زوال کو روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت جوار سے شاہ ولی اللہ کو وجو بخشا۔ ۱۷۰۳ء میں قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر میں پیدا ہونے والے اس علمی خزانے نے مسلمانان ہند میں اصلاح کی نئی لہریں پیدا کیں۔[۲] جدید مورخ عزیز احمد کے بقول شاہ ولی اللہ عہد وسطیٰ اور عہد جدید کے ہند میں اسلام کی اشاعت کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔[۳] خانوادہ رحیمیہ میں پرورش پانے والے اس لخت جگر نے بچپن سے اپنی ذہانت کی داد

حاصل کی اور بڑے ہوکر قرآنی علوم میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ پانچ سال کی عمر میں باقاعدہ تعلیم کا آغا کر کے محدث اور مفسر کی شکل میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے نام سے مشہور ہو گئے اور ہر کوئی یہ ماننے کے لیے تیار ہو گیا کہ شاہ ولی اللہ کی قرآنی بصیرت نے ہند کے مسلمانوں میں قرآنی علوم کا ذوق پیدا کیا۔ وہ ہمیشہ قرآن کی خوش الحانی، تجوید اور قرأت کے ساتھ تلاوت کرتے تھے۔[۴] اُن کے قرانی علوم پر دست رس رکھنے کے بڑے بڑے علماء قائل تھے۔[۵] اُن کی قرآنی فکر تمام دوسرے مفکرین سے منفرد اور جداگانہ تھی، اُن کے قرآنی فکر کے اہم عناصر مکمل و مدلل، مختصر و مجتہدانہ اسلوب کے حامل ہیں۔ یہ تمام عناصر اُن کی حکیمانہ نظر سے اُن کی کتاب "**الفوز الکبیر فی اصول التفسیر**" میں ایک ساتھ جھلکتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے علوم القرآن کی جو تقسیم اس رسالہ کے ابتدایہ میں کی ہے وہ آپ کے علوم القرآن پر مہارت رکھنے کا واضح ثبوت اور دلیل پیش کرتی ہے اور آپ کے مجتہدانہ فکر کا عملی ثبوت ہے۔ شاہ ولی اللہ کی قرآنی فکر "**الفوز الکبیر فی اصول التفسیر**" کے عربی اور اردو تراجم بہت زیادہ مشہور ہوئے، جب کہ اُن کی دوسری کتابوں سے لوگ کم واقف تھے، اس لیے مناسب ہے کہ اُن کی قرانی فکر کو متعارف کرایا اور قرآنی خدمات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے تا کہ اُن کا موقف سمجھنے میں آسانی ہو۔ شاہ ولی اللہ قرآن سے وابستگی کو اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت تصور کرتے تھے، وہ خود اس چیز کے بارے میں اکثر ذِکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس بندہ پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں جن میں سب سے زیادہ عظیم الشان نعمت قرآن کی تفہیم ہے، اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات اس اُمت پر بہت زیادہ ہیں جن میں سب سے بڑا احسان قرآن کی دعوت وتبلیغ ہے۔[۶]

ایک اور جگہ رقم طراز ہیں:

> ''الحمد اللہ اس بندۂ خدا کو ان تمام فنون تفسیر میں خاص مناسبت حاصل ہے اور علوم تفسیر کے اکثر اصول اور اس کے پڑھانے کے ہنر موجود ہیں۔ ان چیزوں کے علاوہ فنون تفسیر کی دو تین فن بھی فیض الٰہی کے بحر بیکراں سے القا ہوئے ہیں۔[۷]

شاہ ولی اللہ کے علمی کارنامے نہ صرف وافر بلکہ فکری طور پر نہایت مؤثر ہیں۔ انھوں نے قرآن کی تعلیمات کے فروغ کے ساتھ دین کے دیگر شعبوں میں تدریس، تصنیف اور وعظ و ارشاد کے ذریعے نمایاں خدمات انجام دیں۔ دعوت و تبلیغ میں قرآن کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے انھوں نے حالات کا ادراک کیا اور عوام کی قرآن سے دوری کے باعث عقائد و اعمال میں پیدا ہونے والی کمزوری کو محسوس کیا۔ اسی لیے انھوں نے قرآن کا فارسی ترجمہ کیا تاکہ لوگ براہِ راست قرآنی ہدایت سے وابستہ ہو سکیں۔ شاہ ولی اللہ کا یقین تھا کہ مسلمانوں کے ایمانی، اخلاقی، سیاسی، معاشی اور سماجی زوال کی بنیادی وجہ قرآنی تعلیمات سے دوری ہے، اور قربِ الٰہی کا راستہ بھی قرآن ہی سے کھلتا ہے۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے قرآن کے اصول و ضوابط مرتب کیے تاکہ عام لوگ اس کا مفہوم آسانی سے سمجھ سکیں۔ ان کی شہرہ آفاق کتاب **الفوز الکبیر فی اصول التفسیر** ایک جامع، مدلل اور نہایت قیمتی تصنیف ہے۔ اگرچہ یہ فارسی میں لکھی گئی، مگر اس کے اردو اور انگریزی تراجم دستیاب ہیں، اور برصغیر کے مدارس میں اسے، بالخصوص **تفسیر جلالین** کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے، اس طرح اسے ایک اہم مقام حاصل ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے مطابق اصولِ تفسیر پر متعدد کتب موجود ہونے کے باوجود **الفوز الکبیر** کلیات کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب سے شاہ ولی اللہ کی بلند فہمِ قرآن واضح ہوتی ہے، جہاں انھوں نے پیچیدہ قرآنی تصورات کو سادگی اور علمی بصیرت کے ساتھ پیش کیا۔ بلاشبہ یہ تصنیف ان کا ایک عظیم، نادر اور قیمتی علمی کارنامہ ہے۔[۸] شاہ ولی اللہ نے نکات قرآن کو اس لیے مختصراً پیش کیا تاکہ طویل تفسیر سے بچ جائیں۔ وہ اپنی اس تالیف میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جب میرے لیے اللہ کی طرف سے کتاب اللہ کو سمجھنے کے لیے دروازے کھل گئے تو میں نے یہی چاہا کہ بعض مفید نکات جو کتاب اللہ کو سمجھنے میں دوستوں کو مددگار ثابت ہو سکتے ہیں، ایک رسالہ میں منضبط کر کے پیش کروں۔ اُمید ہے اللہ تعالیٰ کی مدد سے قرآنی قواعد کو سمجھ لینے کے بعد طالب علموں کو قرآن سمجھ لینے میں آسانی ہوگی۔''[۹]

شاہ ولی اللہ نے قرآنی علوم کو پانچ بنیادی اقسام میں محدود کر کے انھیں اصلِ منصوص قرار دیا اور تمام نصوص کو انہی کے دائرے میں شامل کر دیا۔ ان کے علمی کارناموں کو درج ذیل شعبہ جات میں

تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ پانچ بنیادی علوم کی توضیح جن کی طرف قرآنِ کریم براہِ راست رہنمائی کرتا ہے اور جنھیں مقصدِ نزولِ قرآن قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ اہلِ زمانہ کی فکری سطح کے مطابق نظمِ قرآن کی پوشیدگی کے اسباب کی وضاحت اور ان کے حل کی نشاندہی۔

۳۔ نظمِ قرآن کے لطائف کا بیان اور ممکنہ حد تک اسلوبِ بدیع کی تشریح۔

۴۔ فنونِ تفسیر کا تعارف، نیز صحابہ و تابعین کے درمیان تفسیری اختلافات اور ان کے حل کا بیان۔

۵۔ غرائبِ قرآن کی توضیح اور اسبابِ نزول کا ذکر، جو ہر مفسر کے لیے ناگزیر ہیں۔[۱۰]

قرآن کے فہم میں سب سے بڑی مشکل آیات اور مضامین کے باہمی ظاہری ربط کا واضح نہ ہونا ہے، جو بالخصوص مبتدی افراد کے لیے الجھن کا سبب بنتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اس پیچیدہ مسئلے کا حل اپنی کتاب **الفوز الکبیر** میں پیش کیا ہے۔ اسی کتاب کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ ان اصولوں کو سمجھ لینے سے طلبہ کے لیے کتابِ الٰہی کے فہم کا راستہ کھل جائے گا۔[۱۱]

شاہ ولی اللہ نے علومِ قرآن کو پانچ بنیادی اقسام میں تقسیم کر کے ان کے مضامین اور مقاصد کو واضح کیا ہے:

۱۔ علمِ احکام: قرآن میں عبادات، معاملات اور معاشرت سے متعلق واجب، مستحب، حلال، حرام، مکروہ اور مباح احکام بیان ہوئے ہیں، جو بندوں پر لازم کیے گئے ہیں۔ اس علم کا مقصد عرب معاشرے میں شریعتِ محمدیہ کا نفاذ اور ظلم و جبر سے اجتناب ہے، کیوں کہ احکامِ الٰہی کی نافرمانی اللہ کی گرفت کا سبب بنتی ہے۔

۲۔ علمِ مباحثہ (**علم المخاصمة**): قرآن سابقہ گمراہ اقوام، بالخصوص یہود، نصاریٰ، مشرکین اور منافقین کے باطل عقائد اور طرزِ فکر کو بیان کر کے ان سے اجتناب کی تلقین کرتا ہے۔ ان تاریخی مناظر کا مقصد محض واقعات کی تفصیل نہیں بلکہ کلی اصولوں کی وضاحت ہے، تاکہ انسان اللہ کی اطاعت پر قائم رہے اور خواص و عوام دونوں گمراہی سے متنبہ ہوں۔

۳۔ **تذکیر بآلاءِ اللّٰہ**: قرآن انسانیت کی تہذیب کے لیے نازل ہوا اور فطری انداز میں اللہ کی

نعمتوں اور صفات کا تعارف کراتا ہے۔قرآن میں آسمان وزمین کی تخلیق، بارش، نباتات، رزق، انسانی فطرت اور مصائب کے وقت انسان کے رویّے کو بطور نصیحت بیان کیا گیا ہے، تاکہ شکر اور اطاعت کا جذبہ پیدا ہو۔

۴۔ **تذکیر بایّامِ اللّٰہ** (تاریخی تنبیہ): تاریخ کو قرآن میں ایک مستقل نصیحت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس میں اطاعت پر انعام اور نافرمانی پر عذاب کی مثالیں دی گئی ہیں، جیسے عاد و ثمود، حضرت ابراہیمؑ اور بنی اسرائیل کے واقعات۔اس کا مقصد شرک و گناہ سے نفرت اور اہلِ ایمان کے لیے تسلی پیدا کرنا ہے۔

۵۔ علم آخرت (**علم التذکیر بالموت وما بعدہ**): اس علم میں موت کے بعد کے مراحل— حشر، حساب، میزان، جنت و جہنم— کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔نیز قیامت کی علامات، دجال، یاجوج ماجوج، نزولِ عیسیٰؑ، دیدارِ الٰہی اور جنت و جہنم کے احوال ذکر کر کے دنیا کی فانی حیثیت واضح کی گئی ہے، تاکہ حق پوری طرح نمایاں ہو۔[۱۲]

شاہ ولی اللہ اپنے عہد اور ہندوستان کے حالات پر گہری نظر رکھتے تھے، اسی لیے انھوں نے قرآنی تعلیمات کو آسان اسلوب میں عام کرنے اور قرآن سے دوری کے باعث مسلم معاشرے میں پیدا ہونے والی خرابیوں کو جڑ سے ختم کرنے کا عزم کیا۔قرآن نے جس مثالی سماج کا تصور پیش کیا ہے، وہ الفوز الکبیر میں نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ نے قرآن کے مختلف پہلوؤں— جیسے شانِ نزول، ناسخ و منسوخ، صرف و نحو، اسالیبِ قرآن، حروفِ مقطعات اور تکرارِ مضامین— پر گہری اور ناقدانہ بحث کی ہے، جو آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ ہے۔شاہ ولی اللہ کا اسلوبِ تفسیر دیگر مفسرین سے مختلف تھا۔عام طور پر مفسرین آیات کو تاریخی واقعات کے ساتھ جوڑتے ہیں، جبکہ شاہ ولی اللہ قرآن کے نزول کا اصل مقصد انسانی نفوس کی اصلاح اور باطل عقائد کی نفی قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک قرآن کا بنیادی ہدف فاسد عقائد و اعمال کا خاتمہ اور معاشرے کو درست اسلامی راہ پر استوار کرنا ہے، تاکہ اسلامی روح کی حقیقی شناخت ممکن ہو سکے۔[۱۳]

اُمتِ مسلمہ اس وقت کئی فکری پیچیدگیوں اور فتنہ انگیز مسائل میں گھری ہوئی ہے، جن میں مسئلہ ناسخ و منسوخ نہایت اہم ہے۔اس موضوع پر مفسرین کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے، حتیٰ

کہ منسوخ آیات کی تعداد کے بارے میں بھی آراء مختلف ہیں؛ بعض نے پانچ سو آیات تک شمار کیا، جبکہ جلال الدین سیوطی نے صرف بیس آیات پر اتفاق نقل کیا ہے۔[۱۴] شاہ ولی اللہ نے ناسخ و منسوخ پر مفصل بحث کے بعد مدلل انداز میں صرف پانچ آیات کے منسوخ ہونے کو تسلیم کیا اور باقی میں تاویل کی گنجائش رکھی۔[۱۵] مولانا ابوالحسن علی ندوی نے شاہ ولی اللہ کی تصنیف **الفوز الکبیر** کو دعوتِ قرآن، تدبرِ قرآن اور اصلاحِ امت کے حوالے سے ایک تجدیدی و انقلابی کارنامہ قرار دیا ہے۔[۱۶]

قرآنی تعلیمات پر شاہ ولی اللہ کا عربی رسالہ **الفتح الخبیر بما لا بد من حفظه فی علم التفسیر**، **غرائب القرآن**، شانِ نزول اور مشکل الفاظ کی مختصر تشریح پر مشتمل ہے، جو دراصل **الفوز الکبیر** کا تتمہ ہے۔ مصنف کے مطابق اس میں حضرت ابن عباسؓ کی معتبر تفاسیر اور محدثین (بخاری، ترمذی، حاکم وغیرہ) کی روایات سے ضروری مواد جمع کیا گیا ہے۔[۱۷] یہ برصغیر میں غرائب القرآن پر پہلی منضبط اور مستقل تصنیف ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اس کے پانچویں باب میں غرائب القرآن کو شانِ نزول کے ساتھ بیان کر کے اسے مستقل رسالے کی حیثیت دی۔ **فتح الخبیر** اگرچہ مختصر ہے، مگر جامع اور نادر ہے، جس میں سورتوں سے متعلق اہم اشارات اور مشکل الفاظ کی بامقصد تشریح پیش کی گئی ہے، تاکہ فہمِ قرآن آسان ہو سکے۔[۱۸] شاہ ولی اللہ رسالے کے مقصد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ رسالہ **غرائبُ القرآن** کی جامع شرح ہے جو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ابنِ ابی طلحہ کے واسطے سے مروی روایات پر مبنی ہے، جس کی تکمیل ضحاک کی روایت سے کی گئی ہے، جیسا کہ جلال الدین سیوطی نے **الاتقان** میں ذکر کیا ہے۔ ان دونوں طریقوں کے باوجود جہاں **غرائبِ قرآن** کی مزید توضیح درکار تھی، وہاں نافع ابن الازرق کے منہج کو اختیار کیا گیا۔ اس ضمن میں امام بخاری کی صحیح روایات کو ترجیح دی گئی، نیز معتبر اہلِ نقل اور محدثین کی مستند تفاسیر خصوصاً بخاری، ترمذی اور حاکم سے اسبابِ نزول اس انداز سے جمع کیے گئے ہیں جو مفسرین کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔[۱۹]

انبیاء کرام سے متعلق قرآن میں وارد جن واقعات، معجزات اور قصص کا تذکرہ ملتا ہے ان کی تاویل، تشریح اور تفسیر جو شاہ ولی اللہ نے **الفوز الکبیر** میں کی، ان کا تذکرہ تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء میں بھی کیا ہے، اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"تفسیر کے وہی علوم معتبر ہیں جن کا تذکرہ کیا گیا ہے اور قصص الانبیاء کی

تاویل بھی یہی ہے۔اس کے بارے میں ایک کتاب تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء کے نام سے تالیف کی ہے۔تاویل سے یہاں مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس قوم کے استعداد اور اللہ تعالیٰ کے اختیار کردہ تدبیر اور ان کے مناسب لحاظ سے جو واقعہ رونما ہوتے تھے گویا اسی سے متعلق سورۃ یوسف آیت ۶ میں وارد ہے۔''[۲۰]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے برصغیر کے مسلمانوں کے عقائد کا جائزہ لے کر محسوس کیا کہ وہ قرآنی تعلیمات سے بتدریج دور ہورہے ہیں۔اس خلا کو پُر کرنے اور قرآن کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے انھوں نے براہِ راست قرآن مجید کو اپنی تصنیفات کا محور بنایا۔مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی بداعتقادی، بدعملی اور دینی انحطاط کے پیشِ نظر، انھوں نے قرآن کو فارسی زبان میں منتقل کیا، کیوں کہ اس دور میں فارسی سرکاری اور تعلیمی زبان تھی۔اس اقدام کے ذریعے انھوں نے کئی فکری اور سماجی خطرات کا سدِّ باب کیا، خصوصاً اس وقت جب علما کا ایک بڑا طبقہ یا تو حکومتی مراعات کا عادی ہو چکا تھا یا نفسانی مفاد کے تحت عوام میں غلط دینی رسوم رائج کر رہا تھا۔مزید برآں، انھوں نے ترجمہ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اصولِ تفسیر اور ترجمہ پر رسائل بھی تحریر کیے، جن میں فارسی میں لکھی گئی مشہور تصنیف ''**المقدّمه فی قوانین الترجمة**'' قابلِ ذکر ہے۔اگرچہ یہ رسالہ حجم میں مختصر ہے، مگر فکری گہرائی، بصیرت اور تحقیقی اسلوب کا حامل ہے۔اسے اگر اصولِ تفسیر پر ایک جامع اور مدلل تحریر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا، کیوں کہ ترجمہ درحقیقت تفسیر ہی کی ایک صورت ہے، اور اسی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے مصنف نے اس کی تمہید میں اس موضوع کی بنیاد رکھی ہے۔

"یقول الفقیر الی رحمة اللـه الکریم ولی اللـه بن عبدالرحیم ایں رسالـه ایست در قواعد ترجمه مسماة بالمقدمة فی قوانین الترجمة که درحقیقت تسوید ترجمة قرآن قلم به ضبط آں جاری شده۔"[۲۱]

ترجمہ: اللہ کی رحمت کے دروازے فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم پر کھل گئے اور میں یہ کہتا ہوں، کہ رسالہ جس کا نام ''ترجمہ کے قوانین'' رکھا ہے، قواعدِ

ترجمہ پر مشتمل ہے، کیوں کہ درحقیقت قرآن کا ترجمہ اس وقت ضبطِ تحریر میں جاری ہے۔ اُن کا ترجمہ قرآن "فتح الرحمن بترجمہ القرآن" جوکہ فارسی زبان میں ہے اپنی مثال آپ ہے۔

قرآن کریم کا فارسی ترجمہ "فتح الرحمن بترجمة القرآن" شاہ ولی اللہؒ کا ایک عظیم علمی کارنامہ ہے، جس نے اٹھارویں صدی میں فکری ہلچل پیدا کی۔ اگر چہ علما کی ایک جماعت نے اس کی مخالفت کی، مگر عام مسلمانوں نے اسے ہدایت اور نجات کا ذریعہ سمجھا، کیوں کہ اس سے انھیں قرآن کے مفہوم کو براہِ راست سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں سہولت ملی۔ محققین کے مطابق برصغیر میں پہلا فارسی ترجمہ ۱۵۸۹ء میں مخدوم لطف اللہ بن مخدوم نعمت اللہ نے باب الاسلام سندھ (حیدرآباد) میں کیا، مگر وہ مخطوطات تک محدود رہا اور وسیع اثرات مرتب نہ کر سکا۔ اس کے برعکس، شاہ ولی اللہ کے ترجمے کو تین سو برس سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود غیر معمولی قبولیت حاصل رہی، حالانکہ اس دوران بے شمار تراجم وجود میں آئے۔ مولانا اسحاق بھٹی کے مطابق، اس ترجمے کی اولیت اور مقبولیت کا سہرا شاہ ولی اللہؒ کے سر ہے، کیوں کہ ان میں وہ تمام علمی و فکری اوصاف جمع تھے جو ایک مثالی مترجمِ قرآن کے لیے ضروری ہیں، اور آج تک کسی مترجم میں یہ اوصاف اس جامعیت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکے۔[۲۲]

زمانے کی ستم ظریفی یہ تھی کہ اسی ترجمے کے باعث علما کا ایک بڑا طبقہ شاہ ولی اللہؒ کی مخالفت پر آمادہ ہو گیا اور اسے قرآن کی توہین قرار دیا۔ اس مخالفت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس دور کے علما رائج علمی و منہجی تعبیرات کو ہی مکمل دین سمجھتے اور انہی کی تدریس و تفہیم کو اصل مقصد بنائے ہوئے تھے۔ اس کے برخلاف شاہ ولی اللہؒ نے دین کی صحیح تفہیم کے لیے قرآن کریم کو ماخذِ اوّل قرار دیا اور اس سے براہِ راست استفادہ پر زور دیا۔ ان کے نزدیک قرآن کو محض تعظیم کے لیے غلافوں میں لپیٹ کر طاقوں میں رکھ دینا کافی نہ تھا، بلکہ وہ اسے زندہ، ہمہ گیر اور اہلِ حیات کے لیے عملی رہنمائی سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے قرآن کو سمجھنے، سمجھانے اور اس پر عمل کرنے کی تاکید کی۔ شاہ ولی اللہؒ کی اس علمی کاوش نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے قرآن فہمی کے دروازے کھول دیے، جس کے نتیجے میں بعد کے ادوار میں متعدد تراجم سامنے آئے اور مسلمانوں میں قرآن فہمی کا ذوق نمایاں طور پر بڑھا۔ شاہ ولی اللہ نے قرآن کے اسرار و رموز کی ترجمانی اور حکمت بیانی کو اعلیٰ پیمانے پر بیان کیا ہے۔ اُن کے اس انداز بیان سے اُن کی قرآنی بصارت کا راز معلوم ہوتا ہے۔ یہ حقیقت

مسلم ہے کہ اسلامی تعلیمات میں قرآن کو بنیادی اور اوّلین مقام حاصل ہے، اور اس کی اصل روح کے ساتھ تفہیم ہی دینی فکر کی بنیاد ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اپنے دور کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قرآنی تعلیمات کو عام فہم انداز میں لوگوں تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔ انھوں نے عصری حالات کو سمجھ کر اسی زبان، اسلوب اور لہجے میں قرآن کا ترجمہ کیا تاکہ عوام میں قرآنی شعور بیدار ہو۔ دور کے اسلوب کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن کا ترجمہ کرنا ایک ماہرِفن ہی کا کام ہے، اور شاہ ولی اللہؒ نے فارسی ترجمہ قرآن کے ذریعے اس ذمہ داری کو احسن طریقے سے ادا کیا۔ اس ضمن میں ان کا اپنا بیان نہایت اہم ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

> ''دیگر ترجمہ بزبانِ فارسی بوجہے کہ مشابہ عربی باشد در قدرِ کلام، و در تخصیص و تفہیم وغیرِ آں۔ و آں را در 'فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن' ثبت نمودیم۔ ہر چند در بعض مواضع بسبب خوف عدم فہم ناظراں بدونِ تفصیل آں شرط را ترک کردہ باشیم۔''[۲۳]

قرآنِ کریم میں انبیائے کرامؑ سے متعلق وارد واقعات، معجزات اور قصص کی جو تاویل، تشریح اور فکری تعمیر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے **الفوز الکبیر** میں بیان کی ہے، اسی کی توضیح انھوں نے **تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء** میں بھی کی ہے۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ تفسیر کے وہی اصول وعلوم، جن کا ذکر **الفوز الکبیر** میں ہے، قصصِ انبیاء کی تاویل میں بھی کارفرما ہیں، اسی مقصد کے تحت انھوں نے یہ مستقل تصنیف مرتب کی۔ یہاں تاویل سے مراد وہ الٰہی تدبیر اور اس کے تحت پیش آنے والے واقعات ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور سابقہ اقوام کے حالات میں ظاہر ہوئے، جیسا کہ سورۂ یوسف کی آیت چھے میں اشارہ ملتا ہے۔[۲۴]

شاہ ولی اللہ نے انبیاء کے معجزات، ان کے عادات اور واقعات کی تاویل کر کے ان کی حکمت اور معنویت بیان کی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے قواعد وضوابط کی تشریح کی ہے۔

> **''اعلم ان لاحول الطارئة علی نفوس الکمل و الواقعات المنتظمة فی المثال تکمیله لهم حکما حکمها المنام و کذالک الحوادث الواقعته کلها منامات''**[۲۵]

انھوں نے انبیاء کے معجزات، عادات اور واقعات کی تاویل کے ذریعے ان کی حکمت اور

معنوی پہلو کو نمایاں کیا اور اس ضمن میں باقاعدہ قواعد وضوابط وضع کیے۔ انھوں نے انبیاء کے تمام واقعات کو تمثیلی خواب کے مفہوم میں سمجھتے ہوئے **حجۃ اللّٰہ البالغہ** میں تصریح کی کہ کامل نفوس پر وارد ہونے والے احوال اور عالم مثال میں رونما ہونے والے واقعات حقیقت میں خواب ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو الہام اور قرب کے ذریعے حقائق سے آگاہ کرتا ہے، اور ابداع، خلق اور تدبیر جیسی اصطلاحات کے ذریعے انھوں نے عالمِ کون وفساد اور عالمِ مثال کی فلسفیانہ تشریح کی۔ شاہ ولی اللہ اس بات کے قائل تھے کہ دینی وفکری حقائق لوگوں کی اپنی زبان میں بیان کیے جائیں تاکہ مقاصدِ الٰہی اور امورِ زندگی کو سمجھنا آسان ہو۔ اسی لیے انھوں نے اس امر پر زور دیا کہ اگر علوم وفنون کی زبان عوام سے مختلف ہو تو ان کا عمومی زبان میں ترجمہ ناگزیر ہے، کیوں کہ صحیح فہم وشعور اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب علم کو اس زبان میں پیش کیا جائے جس میں مخاطب کی ذہنی تشکیل ہوئی ہو۔[۲۶]

شاہ ولی اللہ معجزات اور خوارقِ عادات کو اسباب وعلل سے بالکل منقطع نہیں سمجھتے، بلکہ ان کے پردہ میں کارفرما حکمت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک انبیائی معجزات انسانی عادات کے دائرے ہی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں[۲۷] اور قرآن وسنت میں اس نوع کے واضح اشارات موجود ہیں جن کی روشنی میں ہر صاحبِ فہم اور انصاف پسند شخص ان حقائق کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ قرآنی واقعات کے بارے میں ان کی پیش کردہ آرا کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ ان میں گہری عقلی توجیہ اور معنوی تاویل پائی جاتی ہے. عصرِ حاضر کے تقاضوں کے پیشِ نظر مسلمانوں کی خیرخواہی اسی میں ہے کہ قرآنِ حکیم کا ترجمہ سادہ، رواں اور محاوراتی زبان میں کیا جائے، جو تصنع، تکلف اور خودنمائی سے پاک ہو، اور جس میں غیر ضروری قصص یا تفصیلی تشریحات کے بجائے براہِ راست آیات کا ترجمہ پیش کیا جائے، تاکہ خواص وعوام سب یکساں طور پر اس سے استفادہ کرسکیں۔ کتاب فہمی کے باب میں شاہ ولی اللہؒ نے استاد کی ذمہ داریوں کو واضح کرتے ہوئے محاوراتی اور درست ترجمے کی اہمیت پر خاص زور دیا۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے کتاب فہمی کو ایک مستقل فن کی حیثیت دے کر ''فنِ دانش مندی'' مرتب کیا اور اسی عنوان سے ایک رسالہ بھی تحریر کیا، جس میں استاد کے فرائض میں یہ ذمہ داری شامل کی کہ وہ کتاب کی صحیح تفہیم کے لیے طلبہ کے سامنے اس کا درست اور واضح ترجمہ پیش کرے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

عبارتِ کتاب بلغتِ شاگرداں، اگر لغت ایشاں مخالف کتاب باشد۔[۲۸]

’’(کتاب فہمی کے حوالے سے استاد کو چاہیے کہ) اگر شاگردوں کی زبان
کتاب کی زبان سے مختلف ہو تو کتاب کی عبارت کا ترجمہ بھی بیان کرے۔‘‘

شاہ ولی اللہ کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ مسلمان کو روزانہ قرآن وسنت کا کچھ حصہ پڑھنا چاہیے اگر قرآن وسنت کی زبان جانتا ہو تو بہتر ورنہ ہے اُن کا ترجمہ پڑھ کے اپنی سوچ اور فکر کو تازہ رکھے۔

’’و ہر روز حصہٴ از ہر دو (کتاب وسنت) خواندن۔ و اگر طاقت خواندن نہ
دارد ترجمہ، ورقے از ہر دو شنیدن۔‘‘[۲۹]

’’روزانہ کتاب وسنت کا کچھ حصہ ضرور پڑھنا چاہیے۔ اور اگر خود پڑھنے کی
صلاحیت نہ رکھتا ہو تو ان دونوں کے ترجمے کا ایک آدھ ورق ضرور سن لینا
چاہیے۔‘‘

حضرت شاہ ولی اللہ کے علمی کمالات اور ان کی فکری کاوشیں متعدد جہات پر محیط ہیں جو موجودہ بحث سے باہر ہیں، تاہم علمی دنیا میں ان کی سب سے نمایاں خدمت یہ سمجھی جاتی ہے کہ انھوں نے اسلامی عقائد، احکام، قوانین اور روایات کی نہایت حکیمانہ اور معقول تشریح پیش کی ہے۔ انھوں نے قرآنِ حکیم کو عام انسانوں کی رہنمائی کی کتاب کے طور پر پیش کرتے ہوئے انسانی معاشرے کو مرکزِ بحث بنایا اور سماج کے نفع ونقصان، خیر وشر اور بنیادی تقاضوں کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں واضح کیا۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ انھوں نے سماجیات کو باقاعدہ موضوع بنا کر، ابن خلدون کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے، عوامی زندگی کے تمام پہلوؤں پر گفتگو کی۔ اگر چہ ابن خلدون کے بعد امام غزالیؒ، شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلامؒ، امام خطابیؒ اور دیگر اکابر نے بھی اس میدان میں خدمات انجام دیں، مگر حضرت شاہ ولی اللہ نے اسے باقاعدہ ایک مستقل فن کی صورت میں مرتب کیا۔ اسی تناظر میں ان کی تصنیف ”**حجة اللّٰه البالغه**“ ایک شاہ کار علمی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں انھوں نے ’’علم اسرارِ دین‘‘ یعنی دینی عقائد واحکام کی حکمتوں اور فلسفے کو موضوعِ اسلام کے طور پر متعارف کرایا، اور مقدمے میں اس کی تشریح، اہمیت، ضرورت اور افادیت پر مفصل روشنی ڈال کر مقاصدِ الٰہی کی تفہیم کو آسان بنایا۔[۳۰]

شاہ ولی اللہ اپنے عہد میں شریعتِ اسلامی کے سب سے جلیل القدر اور مستند شارح، نیز

احکامِ الٰہیہ کے اسرار ومقاصد کے عظیم ترین حکیم تھے۔[۳۶] انھوں نے اسلام کے بنیادی ماخذ (قرآن) کو مسلمانوں کی شہ رگ اور معرفتِ الٰہی کا اصل مرکز قرار دیا۔ ڈھائی صدیوں کے گزرنے کے باوجود علم و حکمت کے بیش تر سرچشمے انہی کے علمی ذخیرے سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف **حجة الله البالغه** احکامِ شریعت کی ایک مربوط، جامع اور مدلل توضیح ہے، جو حق کو نمایاں کرنے اور سماج کو عدل وانصاف پر قائم رکھنے میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے احکامِ شریعت کے اسرار ومقاصد کو حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں نہایت کامیابی سے واضح کیا ہے۔ مزید برآں، اس میں اسلام کے تمام اہم شعبوں؛ عقائد واعمال، عبادات، سیاست، معاشیات، تجارت، عمرانیات، حدیث وسنت کی حیثیت، احسان وتزکیہ اور جہاد پر تفصیلی اور استدلالی بحث ملتی ہے، اور معاشرے کے ہر طبقے کے لیے اصلاحی رہنمائی فراہم کی گئی ہے۔ اہلِ علم کے نزدیک **حجة الله البالغه** ایک مسلمہ علمی شاہ کار ہے، جسے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں حق وانصاف پر مبنی زندگی کے لیے بنیادی ماخذ اور گزشتہ ڈھائی صدیوں کی سب سے اہم اصلاحی تصنیفات میں شمار کیا جاتا ہے۔

اٹھارویں صدی ہجری میں حضرت شاہ ولی اللہ نے جس علمی، فکری اور قرآنی تحریک کی بنیاد رکھی، اس کے اثرات آج تک برقرار ہیں۔ آپ کے وصال کے بعد اس تحریک کو آپ کے فرزندوں، دیگر خلفا اور بعد کے ادوار میں نمایاں اصلاحی شخصیات، جیسے مولانا حمید الدین فراہیؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا مفتی شفیع دیوبندیؒ سمیت دیگر اکابرینِ دین نے اس فکری جہت کو آگے بڑھانے کی بھرپور کوشش کی۔ ان سب کا مشترکہ مقصد یہ تھا کہ دین کو سادہ اور عام فہم زبان میں پیش کیا جائے، تاکہ عوام براہِ راست اس سے فائدہ اٹھا سکیں اور اس پر عمل کرنا آسان ہو۔ شاہ ولی اللہ تحریک کے ماننے والے جب دوسرے ملکوں میں رہائش پذیر ہوئے تو انھوں نے اُن کے علمی خدمات خاص کر ترجمہ قرآن کی افادیت اور اہمیت کو سمجھ لیا، اُن ہی مصلحینِ امت میں امام انقلاب عبید اللہ سندھی نے "**فتح الرحمن بترجمه القرآن**" کے ترجمے کی خصوصیت کو اِن الفاظ میں پیش کیا ہے:

> ''اس ترجمے کے ساتھ جو تشریحی نوٹ ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ آپ نے ترجمہ کے ساتھ مختصر طور پر جو تشریحی فوائد لکھے ہیں ان کی اہمیت کو میں یورپ میں جا کر سمجھ سکا، اس لیے قرآن عظیم کا مذکورہ ترجمہ میرے نزدیک

ایک ہندوستانی کے لیے تمام تفاسیر سے بہتر کتاب ہے۔''[۳۲]

مولانا علی میاں ندوی نے شاہ ولی اللہ کی تجدیدی، واصلاحی کوششوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

> ''شاہ صاحب نے اس مرض بلکہ وبائے عام کے علاج کے لیے قرآنِ مجید کے مطالعہ وتدبّر اور اس کے فہم کو سب سے موثر علاج سمجھا اور یہ بات محض ذہانت، قوّتِ مطالعہ اور قیاس پر مبنی نہیں تھی، بلکہ ایسی بدیہی حقیقت تھی جس پر قرآن مجید خود شاہد ہے اور نہ صرف عہدِ بعثت کی تاریخ بلکہ اسلام کی پوری تاریخ دعوت اور سرگزشت اصلاح وتجدید گواہ ہے، خاص طور پر حقیقتِ توحید اور حقیقتِ شرک کو ظاہر کرنے کے لیے اس سے زیادہ واضح، اس سے زیادہ طاقتور اور دل نشین ذریعہ کا تصور نہیں ہوسکتا۔''[۳۳]

مولانا مودودیؒ نے اپنی تصنیفات میں شاہ ولی اللہ کے **ازالۃ الخفا** اور **تفہیمات** کے اقتباسات پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ نے مسلمانوں کے ماضی اور حال کا نہایت جامع اور گہرا جائزہ لے کر ان پر مدلل تنقید کی۔ ایسی تنقید کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سماج کے صالح اور باحس عناصر میں دینی بیداری پیدا ہوتی ہے، انھیں حالات کی خرابی بے چین کرتی ہے، اوران کی اسلامی حس اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ زندگی میں جاہلی اثرات انھیں ناگوار محسوس ہونے لگتے ہیں۔ ان میں خیر وشر کی تمیز مضبوط ہو جاتی ہے اور اصلاح کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ مولانا مودودی کے مطابق، اس مرحلے کے بعد مجدد کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ تعمیرِ نو کا ایک واضح نقشہ پیش کرے، اور شاہ ولی اللہؒ نے یہ تعمیری فریضہ بھی اسی جامعیت اور حسنِ ترتیب کے ساتھ انجام دیا جس کا مظاہرہ انھوں نے اپنے تنقیدی کام میں کیا تھا۔

شاہ ولی اللہ کے علمی تناظر میں دیکھا جائے تو ہندوستانی مسلمانوں کا ایک بڑا تاریخی المیہ یہ تھا کہ اسلام سے قدیم وابستگی کے باوجود وہ اس کی اصل روح سے غافل رہے۔ سترہویں صدی کے اواخر تک انھوں نے قرآن وحدیث جیسے بنیادی مصادر سے توجہ ہٹا کر منطقی موشگافیوں، کلامی مناظروں اور فقہی اختلافات کو دین کا مرکز بنا لیا تھا، حتیٰ کہ انھیں ہی اصل دین سمجھ لیا گیا۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے

ہوئے شاہ ولی اللہ نے پہلے باقاعدہ درسِ قرآن کا آغاز کیا اور پھر قرآن فہمی کا ذوق بیدار کرنے اور تدبر و تفکر کی دعوت دینے کے لیے فارسی زبان میں ''فتح الرحمٰن'' کے نام سے ترجمۂ قرآن پیش کیا۔[۳۴]

شاہ ولی اللہ کی قرآنی فکر اسلوبِ قرآنی کی نمائندہ ہے اور کسی مخصوص طبقے یا گروہ تک محدود نہیں، بلکہ قرآن کے بنیادی فلسفے کو نمایاں کرکے انسانی فکر میں تبدیلی کی خواہاں ہے۔ اس کے برعکس بعد کے بہت سے تراجم کسی نہ کسی طبقاتی یا جماعتی رجحان کی جھلک دکھاتے ہیں، حالانکہ قرآن کا مقصدِ نزول پوری انسانیت کو دنیا و آخرت کی بھلائی کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ چونکہ ہر انسان عربی زبان سے واقف نہیں، اس لیے مختلف خطوں کی زبانوں میں ترجمہ ناگزیر ہے تاکہ عام لوگ مقاصدِ الٰہی تک رسائی حاصل کرسکیں۔ اسی لیے مترجمینِ قرآن کے لیے ضروری ہے کہ ترجمہ کرتے وقت مقاصدِ الٰہی کو پیشِ نظر رکھیں، شاہ ولی اللہ کی فکر سے رہنمائی لیں، اور قرآن کے بنیادی پیغام کو سادہ انداز میں عام انسان تک پہنچائیں تاکہ وہ خود بھی اسے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرسکے۔ عصرِ حاضر میں شاہ ولی اللہ کی قرآنی بصیرت کی اہمیت اس لیے بڑھ گئی ہے کہ انھوں نے قرآن کو محض عبادات یا مذہبی ضابطے کی کتاب کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ اسے انسانی زندگی کے ہر پہلو تمدنی؛ دینی، سیاسی اور روحانی کے لیے رہنمائی کا جامع مجموعہ قرار دیا۔ اس بصیرت کے ذریعے آج کے پیچیدہ دور میں انسانی فلاح کے لیے قرآن کے عملی اور ہمہ گیر اطلاق کو سمجھنا ممکن ہوتا ہے، خاص طور پر **الفوز الکبیر** جیسی کتاب کے ذریعے تفسیر کے اصول، دین کے اسرار اور معاشرتی ارتقاء کی گہری بصیرت حاصل کی جاسکتی ہے۔

شاہ ولی اللہ نے قرآن کی روشنی کو محض عبادات تک محدود نہیں رکھا بلکہ معاشرتی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اس کی رہنمائی کو اجاگر کیا، جو آج کے سماجی اور سیاسی مسائل کے حل کے لیے نہایت ضروری ہے۔ **الفوز الکبیر** میں تفسیر کے اصول واضح کیے گئے ہیں، جو موجودہ دور میں قرآنی پیغام کو صحیح طور پر سمجھنے اور غلط فہمیوں سے بچنے میں مددگار ہیں۔ انھوں نے انسانی تمدنی ترقی کے مراحل بیان کیے، جو آج کے معاشرتی اور سیاسی نظام کی بہتر تفہیم اور اصلاح کے لیے اہم ہیں۔ مزید برآں، شاہ ولی اللہ نے دین کے اسرار اور دنیاوی زندگی کے تعلق کو واضح کیا، جیسے **حجۃ اللّٰہ البالغہ** میں دیکھنے کو ملتا ہے، تاکہ روحانی اور عملی زندگی میں توازن قائم رہے۔ ان کا نظریہ صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی فلاح پر مرکوز تھا، جو موجودہ عالمی اور متنوع معاشرے میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ تصانیف جیسے فیوض

الحرمین عملی زندگی میں روحانیت کے اثرات کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتی ہیں۔

الغرض، شاہ ولی اللہ کی قرآنی بصیرت ہمیں قرآن کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر دیکھنے، اس کے گہرے اسرار کو سمجھنے، اور انھیں اپنی زندگی اور معاشرتی نظام میں نافذ کرنے کی رہنمائی فراہم کرتی ہے، جو آج کے دور میں بے حد ضروری ہے۔ عصرِ حاضر فکری انتشار اور گروہی تعبیرات کا دور ہے، جہاں قرآن کو اکثر مسلکی یا نظریاتی مقاصد کے تابع کر دیا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں شاہ ولی اللہ کی قرآنی بصیرت اس لیے اہم ہے کہ وہ قرآن کو اصل ماخذ، زندہ رہنمائی اور پوری انسانیت کے لیے ہدایت کی کتاب کے طور پر پیش کرتی ہے۔ انھوں نے قرآن کو محض تلاوت تک محدود نہیں رکھا بلکہ تدبر، فہم اور عملی اطلاق کو اس کی اصل روح قرار دیا، جو آج کمزور پڑ چکی ہے۔ ان کا منہج دین کو فقہی و کلامی نزاعات سے نکال کر مقاصدِ شریعت اور حکمتِ دین کی طرف رہنمائی کرتا ہے، جس سے دین قابلِ فہم، متوازن اور انسان دوست بنتا ہے۔ ترجمۂ قرآن کے باب میں بھی ان کی فکر رہنما ہے، کیوں کہ وہ قرآن کو عام فہم زبان میں پہنچانے کے قائل تھے۔ اسی طرح ان کی قرآنی فکر فرد اور سماج دونوں کی اصلاح پر زور دیتی ہے اور موجودہ اخلاقی، سماجی اور روحانی بحرانوں کا جامع حل پیش کرتی ہے، جس کے ذریعے قرآن اختلاف نہیں بلکہ اتحاد اور تعمیرِ انسانیت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ تاریخِ دعوت و عزیمت — ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیق ونشریات (اسلام) ۲۰۰۲ء

۲۔ انفاس العارفین — شاہ ولی اللہ، مطبع احمدی (دہلی) ۱۹۳

۳۔ Aziz Ahmad, Studies In Islamic Culture in Indian Environment, Oxford, 1964, 20

۴۔ انفاس العارفین: ۱۵۲

۵۔ انفاس الرحیمیہ — شاہ ولی اللہ، مطبع احمدی (دہلی) ۳۸

۶۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کا فلسفہ — عبیداللہ سندھی (لاہور) ۱۹۴۴، ص: ۵۱

۷۔ مقدمہ فتح الرحمن بترجمۃ القرآن از: امام شاہ ولی اللہ دہلوی، مطبوعہ تاج کمپنی (لاہور)

۸۔ الفرقان بریلی (شاہ ولی اللہ نمبر) ص: ۳۴۱

۹۔ المقدمہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر — شاہ ولی اللہ، مطبع احمدی، ۱۲۰

۱۰۔ ایضاً،ص:۳-۴

۱۱۔ ایضاً،ص:۱

۱۲۔ ایضاً،ص:۷

۱۳۔ ایضاً،ص:۳

۱۴۔ الاتقان،اصح المطابع — جلال الدین سیوطی(بمبئی)۱۹۷۸،جلد:۲،ص:۳۰

۱۵۔ الفوز الکبیر — شاہ ولی اللہ،ص:۴

۱۶۔ تاریخِ دعوت وعزیمت — ابوالحسن علی ندوی،۵:۱۵۰

۱۷۔ مقدمة فتح الخبیر ملحق بالفوز الکبیر — شاہ ولی اللہ(کراچی: کارخانہ تجارت کتب،س ن)، ص:۸۶

۱۸۔ الفوز الکبیرفی اصل التفسیر — شاہ ولی اللہ،ص:۷۰

۱۹۔ ایضاً،فتح الخبیر بما لا بد من حفظ علم التفسیر — شاہ ولی اللہ،ناول کشور(لکھنؤ)۱۳۱۴ھ،دیباچہ

۲۰۔ الفوز الکبیرفی اصل التفسیر — شاہ ولی اللہ،ص:۶۹

۲۱۔ رسالہ دانش مندی — شاہ ولی اللہ دہلوی،مطبوعہ بمع تکمیل الاذہان از مدرسہ نصرۃ العلوم(گوجرانوالہ) ص:۱۸۲

۲۲۔ برصغیر کے اهل حدیث خدام قرآن — اسحاق بھٹی،المنار پبلیکیشنز(دہلی)،ص:۶۷۲

۲۳۔ مقدمه فتح الرحمن — شاہ ولی اللہ دہلوی،مطبوعہ،تاج کمپنی لمیٹڈ(لاہور)

۲۴۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر — شاہ ولی اللہ،ص:۴۹

۲۵۔ حجة الله البالغه — شاہ ولی اللہ،مکتبہ رشیدیہ(دہلی)ص:۱۱

۲۶۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر — شاہ ولی اللہ،ص:۴۹-۵۰

۲۷۔ **تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء** — شاہ ولی اللہ،مطبع مجتبائی(نئی دہلی)ص:۷

۲۸۔ رسالہ دانش مندی،شاہ ولی اللہ دہلوی،ص:۱۸۲

۲۹۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، **المقالة الرضية فی النصيحة و الوصية**،شاہ ولی اللہ اکیڈمی،حیدرآباد،ص:۴۳

۳۰۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا فکر و فلسفہ اور دور حاضر روزنامہ اسلام،لاہور۲۵رفروری۲۰۱۶ء http://zahidrashdi.org/550

۳۱۔ نظامی خلیق احمد"شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات"ادارہ اسلامیات لاہور،۱۹۷۶ء،ص،مقدمہ

۳۲۔ مولانا عبیداللہ سندھی،الفرقان(شاہ ولی اللہ نمبر)ص:۲۶۴

۳۳۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی،تاریخ دعوت وعزیمت،مطبوعہ کراچی،۱۹۸۷ء،جلد:۵،ص:۳۵۹-۳۶۰

۳۴۔ مولانا مودودی، منصب تجدید کی حقیقت اور تاریخ تجدید میں شاہ ولی اللہ کا مقام، الفرقان(شاہ ولی اللہ نمبر)بریلی،۱۳۵۹ھ،جلد:۱۴۷-۹۸

اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)

کے خاص شمارے

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سفر صد سالہ (تاریخ کے آئینے میں) ۲۰۰روپے

سیرت ومغازی کی اولین کتابیں اور ان کے مؤلفین............۲۰۰روپے

اسلامی تہذیب وتمدن (دورِ جاہلیت سے آغازِ اسلام تک)............۳۰۰روپے

معلمِ عصر: سعید نورسیؒ ۲۰۰روپے

پیکر دین ودانش: امام غزالیؒ..............................۳۰۰روپے

قرآن مجید، مستشرقین اور انگریزی تراجم.....................۱۰۰/روپے

مولانا عبیداللہ سندھی..۲۰۰روپے

مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت..۱۵۰/روپے

افکارِ ذاکر..۱۵۰/روپے

ڈاکٹر سید عابد حسین اور نئی روشنی.........................۲۵۰روپے

بیاد پروفیسر مشیر الحق...۲۰۰روپے

نذرِ رومی...۲۰۰روپے

نذرِ علی محمد خسرو...۱۰۰/روپے

بیاد خواجہ غلام السیّدین...۱۰۰/روپے

نوٹ: ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی ۱۰۰/روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۱۵فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطے کا پتا: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

رسالہ جامعہ

کے خاص شمارے

جامعہ ملیہ اسلامیہ منزل بہ منزل ۳۰۰روپے
میر تقی میر (جلد اول و دوم) ۶۰۰روپے
محمد علی اور پروانۂ آزادی................................ ۳۰۰روپے
گاندھی اورگاندھیائی فکر................................ ۳۰۰روپے
جشن زریں نمبر................................ ۱۰۰روپے
ڈاکٹر مختار احمد انصاری................................ ۱۰۰روپے
سالنامہ ۱۹۶۱ء................................ ۱۰۰روپے
اسلم جیراجپوری نمبر................................ ۱۰۰روپے
پروفیسر محمد مجیب نمبر................................ ۱۰۰روپے
مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں................................ ۱۵۰روپے
پریم چند کی یاد میں................................ ۱۰۰روپے
نہرو نمبر................................ ۱۰۰روپے
جامعہ پلاٹینم جوبلی نمبر................................ ۱۰۰روپے
ابوالکلام آزاد نمبر (پہلی اور دوسری جلد)................................ ۳۰۰روپے
خواجہ حسن نظامی اور اُردو نثر................................ ۱۰۰روپے
خلیل الرحمن اعظمی کی یاد میں................................ ۱۰۰روپے
بلونت سنگھ کی یاد میں................................ ۱۰۰روپے
ابوالفضل صدیقی کی یاد میں................................ ۱۵۰روپے
نذرِ انیس ۳۰۰روپے

نوٹ: ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی (۱۹۶۱ء تا حال) فی ۱۰۰/روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۱۵فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطے کا پتا: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئ دہلی۔۱۱۰۰۲۵